

اندازِ بیکانِ اور



راجہ
مہدی
علی
خان

انداز بیان اور

راجہ مہدی علی خان



ادبی دنیا لاہور

ادبی دنیا لاہور

۳۶۰۰	عبدالحمید عدم	رم آہو
۳۶۵۰	،،	زلف پریشان
۲۶۰۰	معین احسن جذبی	فروزان
۲۶۰۰	،، ،،	سخن مختصر
۲۶۲۵	ساحر لدھیانوی	تلخیاں
۳۶۰۰	مرتبہ قیوم نظر	آفتاب داغ
۳۶۰۰	،، تمکین کاظمی	فریاد داغ
۳۶۵۰	شاہد علی خان	انتخاب کلام ظفر
۲۶۵۰	۵۵ء کی بہترین نظمیں حلقہ ارباب ذوق	
۳۶۲۵	بن کپاسی (پنجابی) پر بھ جوت کور	
۲۶۲۵	شاد امرتسری	داغ فراق
۶۶۰۰	صفدر میر	درد کے پھول
۱۶۷۵	اختر شیرانی	صبح بہار
۱۶۷۵	،،	لالہ طور
۱۶۷۵	،،	اختر ستان
۱۶۷۵	،،	شہناز
۱۶۷۵	،،	طیور آوارہ
۱۶۷۵	،،	شہرود
۲۶۵۰	ساعر صدیقی	غم بہار
۳۶۰۰	طاہر ایڈیشن	دیوان غالب
۵۶۵۰	نذیر احمد شیخ	حرف ہشاش
۳۶۰۰	یحییٰ عیش	نالہ ہائے دل
۳۶۵۰	،، نذیر احمد	اقبال کے صنائع بدائع

منفصل فہرست طلب کریں

آئینہ ادب چوک انارکلی لاہور

اندازِ بیباں اور

دورِ جدید کے جن شعراء نے زندگی اور سماج کے چھپے ناسوروں پر تیز نشتر چلانے کا آغاز کیا، ان میں راجہ مہدی علی خاں کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ وہ مولانا ظفر علی خاں مرحوم کے خاندان سے تعلق رکھتے اور پیدائشی شاعر تھے۔ انہوں نے عام ڈگر سے ہٹ کر اپنی شاعری کے لئے جو اسلوب اختیار کیا وہ انوکھا بھی ہے اور نرالا بھی۔

”اندازِ بیباں اور“ مرحوم کی ایسی ہی طنزیہ و مزاحیہ نظموں کا مجموعہ ہے، جن میں انسانی جہالت کے بعض حقائق طشت از بام کر کے خواب پرستوں کی ذہنی اڑان کو روکنے کی ایک کامیاب کوشش کی گئی ہے۔

محمد عبداللہ قریشی

سرورق: پہلاسی



جمہ حقوق محفوظ

تعداد : ۱۱۰۰

۱۹۶۶ء

قیمت ۴۵۰/-



اہتمام و سول کنٹریس
مرآع سلامہ - آئینہ ادب
چوک بینار - انار کلی - لاہور

(مطبوعہ اشرف پریس لاہور)

فہرست

۹	از قیام تا	مقدمہ	۱
۳۶	از راجہ ہمدانی علی خاں	پیری نظموں کا دوست	۲
		(طفیل تسلیمیاں)	
۴۸		چور کی دُعا	۳
۵۰		خزگر شوں کی غزل	۴
۵۲		چربجے	۵
۵۴		پھول کی توبہ	۶
۵۶		نصیحی جوگھی خلیا کی تلاش میں	۷
۶۱		محترمہ مسز آدرا اور ان کے بچے	۸

۱۰۹	سُحران کی جیل	۲۵
۱۱۴	دو ہمسائیاں	۲۶
۱۱۷	جلال نادرہ	۲۷
۱۲۱	جمال نادرہ	۲۸
۱۲۴	چاچا رحیم اللہ	۲۹
۱۲۶	میرے تکیوں پر کھٹے ہوئے اشعار	۳۰
۱۲۸	ہمیں ہماری بیویوں سے بچاؤ	۳۱
۱۳۱	دستک نیم شب	۳۲
۱۳۵	مشنوی تہر عشق	۳۳
۱۳۹	ڈراما شیریں فراد	۳۴
	(پچھم نے لیں آنکھیں کھول)	
۱۴۲	اننگے کی کتابیں — واپسی پر	۳۵
۱۴۷	دو حرام زادے	۳۶
۱۵۰	بعد ذات انٹرویو	۳۷
۱۵۲	مربیان باصفا	۳۸
۱۵۷	سوروں کی بغاوت	۳۹
۱۶۲	مشنوی تاج دین معراج دین	۴۰

	(عہدِ جوانی، سنس، سنس کاٹا)	
۶۳	نگوٹا	۹
۶۶	پھول اور کانٹا	۱۰
۶۷	بنتِ عم	۱۱
۶۹	درزن اور لارڈ کرزن	۱۲
۷۵	بھائی بہن	۱۳
۷۶	فیصلہ	۱۴
۷۷	آخری گالی	۱۵
۸۰	مولوی صاحب کا خواب	۱۶
۸۲	ادیب کی محبوبہ	۱۷
۸۵	ضرورتِ رشتہ اور تصویریں	۱۸
۹۰	ایک اور ضرورتِ رشتہ اور تصویریں	۱۹
۹۶	غندھے	۲۰
۹۸	ایک آنکھ والا	۲۱
۱۰۰	اُس سے اور اُس سے	۲۲
۱۰۳	میاں کے دوست	۲۳
۱۰۶	بیوی کی سہیلیاں	۲۴

۲۰۱	۵۵ - تثنوی قمر الیبیان
	زند کے زند رہے
۲۳۸	۵۶ - خانہ بہرہمان گذاشت
۲۴۲	۵۷ - ایک اور مہمان
۲۴۵	۵۸ - راجندر بیدی اور چور
۲۴۹	۵۹ - حساب دشمنان درود
۲۵۱	۶۰ - زند کے زند رہے

۱۶۷	۴۱ - ایشکان
۱۶۸	۴۲ - کلاہ پوش — بہت بڑا آنسو
۱۶۹	۴۳ - آسمان کا بلبہ
۱۷۰	۴۴ - ایک چہلم پو
۱۷۵	۴۵ - پارٹیشن
	(جنت میں بے چین رہے تھے، دوزخ میں آرام کیا)
۱۷۸	۴۶ - پیر اور مرید
۱۸۰	۴۷ - اجی پیلے آپ
۱۸۲	۴۸ - اڈنگھ
۱۸۳	۴۹ - میں اور شیطان دیکھ رہے تھے
۱۸۵	۵۰ - جہنم میں غنڈے
۱۸۷	۵۱ - جب شام جنت میں ہوئی
۱۸۹	۵۲ - جنت میں حسینوں کی بھوک ہڑتال
۱۹۶	۵۳ - شاعر خدا کے دربار میں
۱۹۸	۵۴ - میرا دوست

مقدمہ

زندگی کی کردوٹوں سے تحصیلِ مسرت کا رجحان، حیرت، استعجاب اور تحسُّس کے ایک شدید جذبے کے تابع ہے اور یہ جذبہ اس بات کا تفسیحی ہے کہ ناظر، زندگی کے مختلف پہلوؤں کا ایک نئے زاویہ نگاہ سے مطالعہ کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک بچے کے لئے تحصیلِ مسرت کے امکانات زیادہ روشن ہوتے ہیں۔ وہ زندگی کے مختلف مظاہر کو جب پہلی بار دیکھتا ہے تو اسے وہ حیرت آمیز مسرت حاصل ہوتی ہے، جو زندگی کا متذرعہ گراں بہا ہے۔ اس کے برعکس ایک سے ماحول کو بار بار دیکھتے چلے جانے سے بے رنگی اور یکسانیت کا احساس پیدا ہوتا ہے جو مسرت کے لئے نہرِ قاتل ہے۔ فن کی دنیا میں بالخصوص تکرار اور تلبیح سے یکسانیت اور بے رنگی مسلط ہوتی ہے اور خط یا مسرت کی تحصیل ناممکن ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ہر اچھا فن کار زندگی کو نہ صرف ایک نئے زاویے سے

دیکھتا ہے بلکہ اپنے فن کی مختلف منازل پر ہر بار ایک نئے زاویہ نگاہ کو وجود میں لاتا ہے۔ نتیجتاً زندگی کے تو کیلئے کنارے اس طور ابھر آتے ہیں کہ نہ صرف خود فن کار اپنے عمل تخلیق سے محفوظ ہونے لگتا ہے بلکہ ناظر کو بھی جمالیاتی حظ پہنچانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ پس عام زندگی کے علاوہ فن کی دنیا میں بھی مسرت کی تحصیل زاویہ نگاہ کی تازگی اور نئے پن کے بغیر ممکن نہیں۔ اس ضمن میں نیچے کا طریق کار مسرت کے متلاشیوں کے لئے مشعل راہ کا کام دے سکتا ہے۔

راہ ہمدی علی خاں کی نظریں تحصیل مسرت کی جو ایک عمدہ مثال پیش کرتی ہیں، اس میں زندگی اور اس کی کرد لوں کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کی وہ روش ہی نہیں ملتی جو بچپن کا طرہ امتیاز ہے بلکہ زندگی سے مسرت اخذ کرنے کا وہ رجحان بھی ملتا ہے جو بچے سے مخصوص ہے۔ جہاں تک زندگی کے عام مظاہر کو ایک نئے زاویے سے دیکھنے کا سوال ہے، راجہ صاحب کے ہاں اس رجحان کے نقوش بہت روشن ہیں۔ اول تو یہی دیکھئے کہ نظم میں ان کا میدان سنجیدہ شعری تخلیق کی بجائے مزاحیہ تخلیق ہے اور مزاح کی نو تازگی اور نئے پن کے بغیر ممکن ہی نہیں بے شک ایک سنجیدہ شعری تخلیق کی عظمت اس بات میں ہے کہ یہ گزر گاہ خاص و عام سے ہٹ کر ایک نئی راہ تراشتی ہے تاہم اگر یہ نئی راہ نہ تراشے تو بھی کم سے کم گوارا اور قابل برداشت ضرور ثابت ہوتی ہے لیکن مزاح کی دنیا کا انداز قطعاً نرالا ہے۔ مزاحیہ تخلیق

اگر حسنی کو میدار نہیں کرتی تو دنیا کامیاب ہو جاتی ہے اور ایک لحظے کے لئے بھی بدشاہت نہیں ہو سکتی۔ چنانچہ مزاحیہ تخلیق کی صرف دو ہی صورتیں ممکن ہیں۔ کامیاب یا ناکامیاب۔ کسی درمیانی منزل کا تصور ناممکن ہے۔ ایک لطیفے کا تجربہ کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس کی تمام تر کامیابی اس کے "اچانک پن" میں ہے۔ اسی لئے جب ایک بار لطیفہ سن لیا جائے تو دوسری بار سننے پر اس کا اثر باقی نہیں رہتا، نیز اگر لطیفہ کسی غیر عمدی کا احساس نہیں دلاتا تو ناکامیاب ہو جاتا ہے راجہ ہمدی علی خاں نے اپنی نظموں میں مزاح کی تخلیق کی ہے اور انہیں اس خاص میدان میں جو کامیابی نصیب ہوئی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ راجہ صاحب نے زندگی کے عام مظاہر کے چھپے ہوئے پہلوؤں پر روشنی کا ایک نیا پر تھلا لایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انھوں نے ایک ایسے نئے مقام سے گرد و پیش پر نظر دوڑا ہے کہ جسے، کردار یا واقعہ کے مضحک پہلو سب سے پس منظر کی نگاہ کا مرکز بنے ہیں، پھر جب وہ ان مضحک پہلوؤں کو ناظر کے سامنے پیش کرتے ہیں تو گویا مسرت کی تخلیق کرتے ہیں۔ اور ناظر ان کا ہم فحان کہان مضحک پہلوؤں سے محفوظ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یوں اس مسرت کا بچپن کے ساتھ ایک گہرا تعلق بھی ہے۔ بچہ دو طرح کی مسرت تک رسائی پاتا ہے۔ ایک تو اس مسرت تک جو حیرت و استعجاب کے باعث وجود میں آتی ہے۔ مثلاً جب وہ ایک خوبصورت پھول، جانور یا مہلبے کو حیرت سے دیکھتا ہے تو فرط مسرت سے تاج اٹھاتا ہے

دوسری طرف بچے کی مسرت زندگی کے مضحک پہلوؤں سے متحرک پاتی ہے
مثلاً جب وہ کسی شے کو ٹوٹتے، بگڑتے یا بد شکل ہوتے دیکھتا ہے تو بے اختیار
ہنسنے لگتا ہے۔ راہبہ ہمدی علی خاں نے اپنی نظموں میں زندگی کے عام مظاہر کے
مضحک پہلوؤں کو پیش کر کے مؤخر الذکر مسرت کے حصوں کے مواقع بہم پہنچائے
ہیں اور اگرچہ ناظر کا ذوق مزاح باندہ تر جیت رکھتا ہے۔ تاہم ناظر کی ہنسی
ناہمواریوں کے وجود ہی سے پیدا ہوتی ہے۔ اور یہ ناہمواریاں بچپن سے تعلق
بگڑی ہوئی یا بد شکل صورتوں ہی کا ایک ارتقائی روپ ہیں (ناہمواریوں سے
تحصیل مسرت کے اس رجحان کا تفصیلی ذکر آگے آئے گا)

راہبہ ہمدی علی خاں کی نظموں میں پرانی اشیاء کو ایک نئی روشنی میں دیکھنے
کا وہ رجحان ہی نہیں ملتا جو ناہمواریوں کو سطح پر لا کر تحصیل مسرت کا موجب بنتا
ہے بلکہ ان کے ہاں زندگی کے مظاہر، کیفیات اور عناصر سے مسرت کا آخری
قطرہ تک پھوٹ لینے کی وہ روش بھی موجود ہے۔ جو اردو نظم کی عام ڈگر سے
ہٹ کر معروض وجود میں آئی ہے۔ اردو غزل میں غم، کسک اور نفی کا رجحان
عام طور سے رائج رہا ہے اور اردو نظم نے زیادہ تر جدید دور سے قبل
نظریات کی تبلیغ کے لئے ایک حربے کا کام دیا ہے۔ البتہ جدید نظم میں اندر
کی دنیا سے متعارف ہونے اور داخلی غم کو سطح پر لے آئے کا وہ رجحان ابھر آیا ہے
جو اب تک صرف غزل سے خاص تھا۔ اور نتیجتاً اردو نظم نے ایک ہی جست

میں فن کی بہت سی منازل کو طے کر لیا ہے۔ شاید یہ ہمارے مخصوص فلسفیانہ انداز
کا نتیجہ ہے کہ ہندوستان میں فرادانی کے باوصف زندگی کی نفی کا رجحان مسلط رہا
ہے اور فرد نے ارضی عوامل سے قطع نظر کر کے حیات جاوید کی تلاش میں اپنی
تمام تر مسماعی کو وقت رکھا ہے۔ زندگی بعد از موت کے تصور کی مقبولیت کی
وجہ غالباً یہی ہے۔ پھر حیات جاوید کی تلاش میں زندگی کی عام مسرتوں اور
رغباتوں سے کنارہ کش ہونے کا جو رجحان ابھر اور جسے ہمارے مخصوص
فلسفیانہ اور مذہبی نظریات نے فروغ دیا، خود ہمارے ادب، بالخصوص
شاعری پر بھی اثر انداز ہوا اور ایک ناآسودگی، غم اور خلش نے ہماری اہتمام
شعر بالخصوص غزل میں مستقل جگہ بنالی۔ اس پس منظر میں راہبہ ہمدی علی خاں
کی نظموں کا مطالعہ کریں تو صاف محسوس ہوتا ہے کہ اس شاعر نے زمین
مسرت کی نفی کرنے کی بجائے ایک مثبت طریق کار کو جزو جان بنایا ہے اور زندگی
کے مظاہر سے کنارہ کش ہو کر اپنی ذات میں سمٹنے کی بجائے زندگی کے مظاہر کی
طقت پیش قدمی کی ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ عظیم شاعری دروہندی
اور غم کی پیداوار ہے اور اسی لئے بذلہ سنجی (WIT) کی شاعری کو فن کے
زینے پر کوئی بلند مقام حاصل نہیں۔ تاہم یہ شاعری فرد کو زندگی اور اس
کی مسرتوں سے قریب تر لانے کا جو ضروری فریضہ سر انجام دیتی ہے اس
کی اہمیت کسی طور بھی نظر انداز نہیں ہو سکتی۔ ایک تڑپ ہی دیکھے کہ یہ عمل

ذہنی اور جسمانی صحت پر دالنا ہے اور ناظر کو ایک صحت مند نقطہ نظر سے آشنا کرتا ہے۔ دوسرے فن میں نردال اس وقت نمودار ہوتا ہے جب وہ اپنے ارتقائی مراحل پر پہنچنے کے بعد اپنے منبع یا زمین سے منقطع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ زمین اور اس کے مظاہر کے رشتہ قائم رکھنے کی یہ روش (جسے راہبہ ہندی علی خاں نے پیش کیا ہے) فن کی سلامتی کے لئے ضروری ہے کہ یہ فن کار کو اپنے پس نظر سے نا آشنا نہیں رہنے دیتی اور اس کے فن میں اسد گرد کے ماحول کا شعور سرا وجود رہتا ہے۔

ماہرہ ہندی علی خاں کے ان مسرت اخذ کرنے کار ججان ان نظموں میں بہت نمایاں ہے جو عورت اور مرد کے ربط یا ہم سے متعلق ہیں۔ اس ربط کے سلسلے میں شادی سے قبل کی جذباتی محبت اور شادی کے بعد کی غیر جذباتی مسکن ہمدردانہ وابستگی کو راہبہ صاحب نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے اور اپنی مخصوص اقتاد طبع کے زیر اثر اس ربط کے ان پہلوؤں کو زیادہ اہمیت دی ہے جو زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتوں اور ناہماریوں سے متعلق ہیں نہ کہ ان پہلوؤں کو جو نا آسودگی، غم اور محرومی کے باعث ایک انوکھی شدت اختیار کر لیتے ہیں۔ ایک طرح سے دیکھیں تو اس میں انسان کی عظمت بھی ہے کہ وہ اپنی جذباتی کیفیات سے خود کو الگ تھلاگ کر کے ان پر ایک نگاہ ڈالے اور پھر ہنستا شروع کر دے۔ یہی اس طریق کار کی دو صورتیں

ہیں۔ ایک تو غالب کا سا انداز جہاں مزاج ایک شدید یا سببیت اور احساس محرومی سے متحرک لیتا ہے اور ایک ایسی صورت حال کو معرض وجود میں لاتا ہے جہاں آنسو اور تبسم ایک دوسرے سے ہم کنار ہو جاتے ہیں۔ یہ فن کی معراج ہے۔ دوسری صورت ایک ایسے باشعور انسان کا طرز عمل ہے جو جذباتی روابط کی ناہماریوں کو پالیتا ہے اور پھر ایک شرارت آمیز تبسم کے ساتھ ان کی تقاب کشائی کرتے لگتا ہے۔ لیکن جیسا کہ اوپر ذکر ہوا یہ صورت حال راہبہ ہندی علی خاں کے کسی شعوری عمل کا نتیجہ نہیں، بلکہ ان کی اقتاد طبع اور ایک مخصوص ادبی نگاہ کی پیداوار ہے۔ وہ اس طرح کہ راہبہ صاحب کے ہاں ایک بچے کی سی معصومیت اور کھلند راہن ہے۔ جس کے تحت وہ زندگی سے ہم کنار ہوتے اور اس کے مظاہر کے ساتھ گویا آنکھ پھولی کھلتے چلے جاتے ہیں۔ اس طرز عمل نے محبت کے موضوع کے سلسلے میں ان کی نظموں پر گہرے اثرات ترسم کئے ہیں۔ اور محبت کی طرف ان کے رد عمل کو اس طور متاثر کیا ہے کہ اس میں معنی، چمک، خوش باشی اور محبت کی مسرتوں سے لطف اندوز ہونے کا رجحان ابھرا ہے نہ کہ محبت کے غم میں ڈوبنے اور دنیا جہاں سے الگ تھلاگ ہو کر محبت کی گریباک کیفیاتوں کو بیٹھنے سے لگانے کا رجحان۔ چنانچہ ان کی اس قسم کی نظموں میں لڑکے اور لڑکی کی محبت تفصیل مسرت کی ایک دلچسپ مثال پیش کرتی ہے۔ مگر ہے بعض بگ یہ کہیں کہ اس

طرح تو پھر راہ صاحب کی پیش کردہ "محبت" میں سستا پن ہے جو کسی
 طور بھی قابل قبول نہیں لیکن درحقیقت بات اس سے قدرے مختلف ہے۔
 اگر تو راہ صاحب محض دونوں جوان دلوں کی محبت کے چند سطحی پہلوؤں تک
 محدود رہتے تو اعتراض جائز تھا لیکن یہاں لطفت کی بات یہ ہے کہ راہ
 صاحب نے ان سطحی پہلوؤں کو پیش کرتے وقت محبت کی جذباتیت کو
 مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ وہ محبت کی ناہمواریوں کو اس انداز سے پیش
 کرتے ہیں کہ جذباتی کیفیات مضحکہ خیز نظر آنے لگتی ہیں اور ناظر، شاعر
 کے، شرارت بھرے تبسم کا سہارا لے کر ہنسنے لگتا ہے۔ کورٹ شپ کے
 ایام سے متعلق راہ صاحب کی یہ چند نظمیں دیکھئے۔ ان نظموں کے مطالعہ
 سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ شاعر نے محبت کے پُرست پہلوؤں کو ہی
 زیادہ تر اپنی نگاہ کا مرکز بنایا ہے اور محبت کی ان کربناک کیفیات کو منظر
 عام پر لانے کی کوشش نہیں کی جو فراق، ناکامی یا حادثے سے وجود
 میں آتی ہیں۔ اور یہ شاعر کی اُفتادِ طبع کے مطابق بھی ہے۔

توہی جا کوٹھے پر سو سن میں تو بس اب جا چکی
 تیر تیر کون واں جائے گا میں باز چپکی

جب بھی نہیں اوپر ہوں جاتی
 سامنے اس کو ہوں پاتی

وہ نگور اچھ کر جانے کیوں کتنا ہے ہائے
 اب کو سو سن کوئی کیا خاک اس کو ٹھے پہ جائے
 دس دفعہ میں کل گئی جب
 کیا تباؤں ات مرے رب
 دس دفعہ ہی میں نے پایا اس کو اپنے سامنے
 مجھ کو تک تک کر دکا کم بخت دل کو تھامنے
 آذرا کوٹھے پہ جائیں
 آدھی چُنری سکھائیں
 اُس نگورے مردوے کو مُنہ لگائیں گے نہ ہم
 وہ بھر ہو گا اُدھر چُنری سکھائیں گے نہ ہم

”نگور“

مردو :- ادھر دیکھئے اک نظر بناہ پرورد
 کہ منے کو تشریف لائے ہیں مردو
 ذرا اپنے چہرے سے زلفیں ہٹا کر
 ہمیں دیکھئے اک نظر مسکرا کر
 مشینوں پہ کپڑے سٹے جا رہے ہیں
 رُداؤں پہ جھٹے کئے جا رہے ہیں

جہیز اپنا سینا اری اے جینا

مگر میرا چاک گریباں نہ سینا

نگاہیں اٹھا کر ادھر دیکھ دزن

کھڑا ہے ترے سامنے لارڈ گرون

چلو چھوڑو مسٹریہ بکواس کینک

تم اس گھر میں تڑپو گے بے آس کینک

کبھی لڑکیاں ایسے پھنتی نہیں ہیں

ہنسنا تو بے درد ہنتی نہیں ہیں

مچلتا ہوں کب تک دُور رہ کے

قریب آؤں میں ایک وقتیں کہہ کے؟

کم از کم رہو سو قدم دُور مجھ سے

چپت ورنہ کھاؤ گے بھر پور مجھ سے

چلے آئے پھر عشق کا سارے کر

بلاؤں میں امی کو آواز دے کر؟ وغیرہ

دزن اور لارڈ گرون

نہیں آتی ترکیا ہے، ہم نہیں انگلش پڑھا دیں گے

کتا ہیں مت رنگا نا سب کی سب ہم کل ہی لادیں گے

لڑکی :-

نہیں اس کی ضرورت کیا ہے یہ تکلیف مت کیجے

مناسب ہے یہی بی اے کا پہلا امتحان دیکھے

لڑکا :-

کسی کی بات میں کیوں آ رہے تم کو پسینے ہیں

ابھی تو امتحان میں ٹھیک پونے نو مہینے ہیں

لڑکی :-

بہت رہتی ہے، جنم دھاڑ سب بچوں کی اس گھر میں

پڑھے گا خاک کوئی اتنا وا دیلا ہو جس گھر میں

لڑکا :-

ارے ہر شام کچھ بانج میں ہم بیٹھ جائیں گے

اُسٹھے اُسٹھی یا طوفاں ہم نہیں انگلش پڑھیں گے

لڑکی :-

اجی چھوڑو یہ باتیں اپنا دل تم کو کچھ ہو گم

کو نا صاف اجھڑے عشق کرنا چاہتے ہو تم!

————— "بنتِ عم"

وہ دبے پاؤں گھر سے آتی ہے

لے کے اپنی اداؤں کے لشکر

سوچتا ہے کدھر یہ جاتی ہے

چاند حیرت سے اُس کو کاتا ہے

اُس کی ہر اک مراد کھلتی ہے

گلستاں کی حسیں ہواؤں میں

رات کو چھپ کے اُس سے ملتی ہے

دن میں کہتی ہے جس کو وہ بھائی

————— "بھائی بہن"

ان نظموں کے مطالعہ سے ایک تو یہی خیال پیدا ہوتا ہے (اوپر اس کا ذکر تھا) کہ راجہ صاحب محبت میں ہنسی، چٹل، مذاق اور مسرت کو زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ دوسرا احساس یہ مرتب ہوتا ہے کہ وہ خود ہی اس محبت کو مذاق کا نشانہ بھی بنتے ہیں۔ مثلاً "گلوڑا" میں انہوں نے چٹری سکھانے کے بہانے کو مذاق کا نشانہ بنایا ہے۔ اسی طرح "بنتِ عم" میں محبت کی جذباتی سطحیت کو اجاگر کیا ہے۔ ناظر ان نظموں کے مطالعہ سے تیسرا تاثر یہ قبول کرتا ہے کہ محبت کے سلسلے میں شاعر کے پیش نظر انسانی زندگی کا صرف وہی دور ہے جو آغازِ شباب کا زمانہ ہوتا ہے اور جسے کسی بہتر نقطہ کی عدم موجودگی میں (ADOLESCENCE) کا دور کہنا چاہیے۔ اس دور کی محبت میں ناپختگی، اضطراب، جذباتیت، چٹک اور ہنسی اور مذاق کی فراوانی ہوتی ہے۔ گویا محبت میں "کھلندہ راپن" موجود ہوتا ہے۔ راجہ صاحب نے محبت کے لاتعداد مختلف پہلوؤں میں سے "کھلندہ راپن" کے پہلو کو اس لئے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے کہ ایک تو یہ پہلو خود شاعر کی مخصوص اُقتادِ طبع کے عین مطابق ہے۔ دوسرے جس قدر جذباتی اور ناپختہ کوئی کیفیت ہوگی، اتنا ہی مذاق کا نشانہ بھی بنے گی۔ چنانچہ راجہ صاحب آغازِ شباب کی محبت کو اس کی تمام تر ناہمواریوں اور بدحواسیوں کے ساتھ پیش کر کے مزاح کی تخلیق کرتے ہیں اور اُس کے نتیجے کے طور پر قاری کو مسرت بہم پہنچانے میں

کامیاب ہو جاتے ہیں۔

عورت اور مرد کے ربطِ باہم کی ایک صورت تو اٹھتی جوانی کی وہ جذباتی محبت ہے جسے راجہ صاحب نے اپنی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ربط کی دوسری صورت ازدواجی زندگی کا وہ خاص رنگ ہے جو ایک کامیاب جذباتی محبت کا ضروری نتیجہ ہے۔ اس رنگ کو اجاگر کرنے میں راجہ صاحب نے اس "تضاد" کو موضوعِ سخن بنایا ہے جو جذباتی محبت کی ماورائی کیفیات اور ازدواجی زندگی کی خالص ارضی حیثیت میں ہے اور اس طرح خوابوں کی شکست و ریخت کے سارے منظر کو پیش کر دیا ہے۔ اس عمل سے کوئی اہم انگیز کیفیت معرضِ وجود میں نہیں آئی بلکہ انسانی فطرت کی ایک نمایاں غیر ممواری سطح پر نمودار ہوئی ہے۔ اور اسی لئے یہ ناہمواری تفریحِ طبع کا موجب بنی ہے۔ پھر دیکھنے کی بات یہ بھی ہے کہ جب راجہ صاحب ازدواجی زندگی کی نھنی نھنی ناہمواریوں کو پیش کرتے ہیں تو قاری کے دل میں شادی کے بعد کی زندگی کے خلافتِ نفرت کا کوئی جذبہ پیدا نہیں کرتے، بلکہ دل چسپ بات یہ ہے کہ عورت اور مرد کے اس طویل ربطِ باہم کو اجاگر کرتے وقت وہ ہمدردانہ اندازِ نظر کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ اس طور کہ ازدواجی زندگی کا زمانہ بجائے خود ایک دل چسپ کھیل کی صورت میں نظر آنے لگتا ہے۔ اس ازدواجی زندگی میں عورت اور مرد اپنے جذباتی اور ذہنی بھگدوں کے باعث ایک

دوسرے سے متصادم ہوتے، ایک دوسرے کو ہدف طنز بناتے اور ایک ہنگامی
 نا اُسودگی کا مظاہرہ ضرور کرتے ہیں تاہم ایک تو اس سارے کھیل کی نوعیت
 نیم سنجیدہ ترک جھونک سے آگے نہیں بڑھتی۔ دوسرے اس کے پس پشت
 شاعر کا ہمدردانہ اذیت نظر سے اہلیہ کا روپ اختیار کرنے سے باز رکھتا ہے
 نتیجتاً ازدواجی زندگی کی یہ تمام تصاویر فرحت، انبساط اور اُسودگی کے
 مواقع بہم پہنچاتی اور یوں اس ربط یا ہم کو زندگی کے ایک نہایت خوشگوار
 دور کی صورت میں پیش کر دیتی ہیں۔ یہ سب کچھ شاعر کی اُفتادِ طبع کے مطابق
 بھی ہے کہ اس کا مسلک زندگی کی مختلف کردوٹوں کے تحصیلِ مسرت کے سوا
 اور کچھ نہیں۔ اس نکتے کے ثبوت میں یہ چند مثالیں قابلِ غور ہیں :-

تو ہے اک ڈاکو کا بیٹا تو نہیں رو میری جاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا چیم دھاڑ خاں

ایک دن کا ذکر ہے روتی تھی میں سوتی نہ تھی

باپ تیرا چپ کر انا تھا میں چپ ہوتی نہ تھی

تھوڑا لیں اُس نے اک نکتے سے میری پسلیاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا چیم دھاڑ خاں

”جلالِ زادہ“

کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

اے مری رُو دھٹی ہوئی بیوی ذرا منہ سے بول

شک نہ کر مجھ پہ مری جان سے پیاری تراز
 پڑھ رہا تھا کسی مسجد میں تجسد کی نماز
 ایک ہی صفت میں کھڑے تھے وہاں محمود و بیاز
 نہ کوئی بندہ وہاں تھا نہ کوئی بسندہ نواز

میرے ہی گھر سے نہ کر ہائے مرا بہتر گول

کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

پھول اک روز تر سے پیار کے توڑے میں نے

کھٹے والد سے ترے عشق میں کوڑے میں نے

مرد میں بات تر سے پھوٹی نہ چھوڑے میں نے

بجر سسرال میں دوڑا دنے گھوڑے میں نے

اپنے ماضی کے ترازو میں ذرا مجھ کو تول

کھٹکھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

”دھک نیم شب“

(۱)

زمین کے چاند ترا حُسنِ آسمانی ہے

ہر ایک جلوہ ترا اک نئی کہانی ہے

ہے تیرے جلووں سے رخشہ میری عمر کی رات
 زہے نصیب کہ تو ہو مری شریکِ حیات
 گھر آؤں گا جو سہرا شام ہو کے میں بے حال
 نہال دل کو کریں گے یہ تیرے پھول سے گل
 گلے میں ہوں گے مرے ہر تیری باہوں کے
 چمک اٹھیں گے تارے تری نگاہوں کے
 خدا کے واسطے کھو لو بھی آ کے دروازہ
 میں کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں چیخ رہا
 اگر علیل نہ ہو آپ کا مزاج شریف
 تو بیکھا بھلے ذرا اکٹھ کے کیجئے تکلیف
 یہ چار پائی مری ٹیڑھی کیوں بچانی ہے
 بھلا اکتی یہ کیوں فرش پر گرانی ہے
 چپا تیاں مرے اللہ سب کی سب کچھی
 تمام عمر ہی شاید رہو گی تم کچھی —

— "اس سے اور اسی سے"

بحیثیتِ مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ راجہ ہندی علی خاں کی نظموں میں
 شادی سے قبل اور شادی سے بعد کی زندگی کے ایسے تمام پہلو پیش ہوئے

ہیں جو تا ہمواریوں کو جنم دے کر مسرت و بہجت کے مواقعے بہم پہنچاتے ہیں۔
 اسی طرح انہوں نے اپنی نظموں میں محبت کے خالص ارضی پہلوؤں ہی کو
 زیادہ تر پیش نظر رکھا ہے۔ یہ محبت آدم اور حوا کی سیدھی سادھی اور
 بے لوث محبت ہی کا عکس نہیں بلکہ اس میں رُوح کی بجائے جسم زیادہ نمایاں
 اور اس کے نتیجے کے طور پر جسم کے صحت مند خون کا رنگ زیادہ روشن ہے
 ان کے کردار محبت کے مادی پہلوؤں سے متاثر اور اس کے ارضی کیفیت سے
 لطف اندوز ہوتے ہیں۔ مثلاً ان کے پہلے مجموعہ کلام "مضرب" کی بیشتر
 نظموں میں محبت کا جذبہ، رنگیں خطوط، چھڑ چھاڑ اور محبوب کے جسم سے
 مس کی ہوئی اشیاء — انگٹھری، رومال وغیرہ تک محدود ہے اور اس
 مجموعے کے بعد کی نظموں میں چھڑ چھاڑ، نوک جھونک اور قلمیٹھن (FLIRTATION)
 کے پہلو زیادہ نمایاں ہیں اور ان کے اس سارے طریق کار میں بچپن کے رجحانات
 منعکس ہیں۔ خود بچہ اپنے قد کے مطابق ارد گرد کے ماحول کو دیکھتا ہے اور
 چونکہ وہ اپنے بڑوں کی یہ نسبت زمین سے زیادہ قریب ہوتا ہے اس
 لئے زندگی اور ماحول کی طرف اس کے رد عمل میں بھی زمین اور گوشت پرست
 سے وابستگی زیادہ ہوتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ بچہ
 سب سے بڑا مادہ پرست ہے اور باہر یہ عیش کوش کا سب سے بڑا علم بردار۔
 بچے کے اس صحت مند رجحان کو اگر بعد کی زندگی میں قائم رکھا جائے تو

جوانی کی محبت کے بارے میں وہی رد عمل اُبھرتا ہے، جسے راجہ ہمدی علی خاں نے پیش نظر رکھا ہے اور جس کے نتیجے کے طور پر محبت کا جسمانی اور مادی پہلو اُبھر کر نمایاں ہو جاتا ہے۔

راجہ ہمدی علی خاں کے ہاں تحصیلِ مسرت کا یہ رجحان آدم اور حوا کی کہانی کے مکرر بیان تک ہی محدود نہیں۔ اس کہانی کے مختلف کرداروں کی مسرتوں اور خواہوں میں شرکت کرنے اور ان کی ناہمواریوں کو مذاق کا نشانہ بنانے کی یہ روش وسیع تر زندگی کی ناہمواریوں تک بھی پھیلی ہوئی نظر آتی ہے جس طرح وہ توخیز جذباتی محبت کی ناہمواریوں کو گرفت میں لیتے ہیں اور ازدواجی زندگی کی سنجیدہ فضا میں مضحک پہلو تلاش کر لیتے ہیں بالکل ایسی طرح وسیع تر زندگی کی بے رنگی، یکسانیت اور سنجیدگی میں بھی انہیں انسانی افعال کے مضحک پہلوانی الفور نظر آ جاتے ہیں۔ زندگی کا ایک عام ناظر عادت اور تکرار کے حصار میں اس بُری طرح قید ہوتا ہے کہ اُسے اشیاء کے نوکیلے کنارے نظر ہی نہیں آتے۔ دوسرے لفظوں میں وہ زندگی کی پامال راہوں میں ایک مشین کی سی سنجیدگی کے ساتھ رواں دواں رہتا ہے اور اُسے کبھی ایک لحظہ کے لئے رُک کر اپنے اور اپنے ساتھیوں کے جذباتی اہٹاک پر غور کرنے کی فرصت ہی نہیں ملتی۔ ایسا شخص نہ تو کبھی ایک اچھا فن کار بن سکتا ہے اور نہ اُسے انسان کے جذباتی تقاضوں

پر ہنسنے کا منصب ہی حاصل ہو سکتا ہے۔ راجہ ہمدی علی خاں کی نظموں کی اہمیت اس بات میں ہے۔ کہ شاعر نے عام زندگی کے مضحک پہلوؤں کو تلاش کیا ہے اور پھر ان ناہمواریوں کو سطح پر لانے کی کوشش کی ہے۔ اس سے ایک عام ناظر کو لحظہ بھر کے لئے رُک کر اپنے جذباتی اہٹاک پر ہنسنے کا موقع بھی ملا ہے۔ گویا شاعر نے ناظر کو زندگی کی بے رنگی اور یکسانیت کا احساس دلانے کے لئے اس سب سے بڑے انسانی المیہ پر زور نہیں لکھا بلکہ محض اس کی مضحکہ خیز صورت پر سے پردہ اٹھایا ہے اور ناظر کو یکجہت انسانی افعال کی ناہمواریوں کا احساس ہونے لگا ہے۔ یہ چند ٹکڑے دیکھئے:-

آئی جو ایک اور بھی آتی چلی گئیں

چھوٹے سے ایک گھر میں سمائی چلی گئیں

بچوں کی فوج لے کے ہوئیں گھر پر حملہ زلہ

ہم دشمنوں کے ہوش اڑاتی چلی گئیں

غینچہ دہن اُگلتے ہے دودھ بار بار

یہ بار بار دودھ پلاتی چلی گئیں

نٹھوں نے فرشِ پاک پر دریا بہائے

دریاؤں میں یہ بسند لگاتی چلی گئیں

بچوں نے پھڑے ناک سے نغے شر شر

ناکیں پکڑ کے "چھوں" یہ کراتی چلی گئیں "بیوی کی بیسیا" ۲۷

رضیہ ذرا گرم چادر تو لانا
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی پلانا
ہزاروں جوازوں میں بس ایک تھا وہ

مٹکانا پلاؤ ذرا اور حلالہ
بعد صبح دیکھتے ہیں ادھر غم ہی غم ہے
بڑھانا ذرا تو رے کا پیالہ
کہیں اس کا بھنا بھی ماتم دم ہے

یہ ننھی کے زردے میں کشمش ہو تھوڑی
وہ ٹکڑا جگر کا تھا آنکھوں کا تارا
بہت دیر سے مانگتی ہے نگوڑی
ہمیں اپنی اولاد سے بھی تھا پیارا

پڑا ہے پیلاؤ میں گھی ڈالنے کا
دلہن سے کہو آہ اتنی نہ روئے
خدا تو ہی حافظ ہے نیرے گلے کا
بے چارہ نہ بے کار میں جان کھوئے

اری بوٹیاں تین سالن میں تیرے
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
یہ چھپڑا کھٹا تھا تقدیر میں میرے
ہزاروں جوازوں میں بس ایک تھا وہ

—————
”ایک چلم“

گتا کیوں ابہنی دم دباتا ہے؟
تھوڑی پوری میں کتنے مانی ہیں؟
کتنے میں ایک بندر آتا ہے؟
شہر میں کے مکان خالی ہیں؟

آج کیا بھاؤ ہے بتا شے کا؟
کیٹس کا ذرن کتنے ماشے تھا؟
لانگ فیلو کی کتنی مانگیں تھیں؟
صبح مرغے نے کتنی بانگیں دیں؟
اُردو ناول میں کیا جھکاؤ ہے؟
کیوں نہی شاعری میں تاؤ ہے؟

—————
”بورڈ آف انٹرویو“

لہنا سنگھا کلمہ پڑھا!

لاالا — آگے بڑھا!

آگے آپ بتا دیجے،

میری جان بچا لیجے،

آگے بچھے اگر آتا

تم سے میں کیوں پڑھواتا

سوچ نہ اب بے کار رحیم!

مار اس کو تلوار رحیم!

دُور ہوں اس کے سب کھڑے

کر دے اس کے دو ٹکڑے

—————
”پارٹیشن“

ان نظموں کے مطالعہ سے محض یہی تاثر مرتب نہیں ہوتا کہ راجہ
نہدی علی خاں زندگی کے رُخ روشن کے خوشگوار یکیں بھٹک پہلوؤں

کو پیش کر کے سرت و صحت کی ایک نضا قائم کر لیتے ہیں، بلکہ یہ احساس بھی ہوتا ہے کہ وہ زندگی کی المناک حقیقتوں کے مضحک پہلوؤں تک رسائی حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہیں۔ "ایک چہلم" کے سلسلے میں انھوں نے دُلہا کی المناک موت کے پس منظر پر انسان کی ریابکاری، تصنع اور دنیا داری کے نقوش کو اس طرح اجاگر کیا ہے کہ ناظر اس "ٹریجڈی" سے متاثر ہونے کی بجائے "طرزِ تپاکِ اہل دنیاہ کو دیکھ کر ہنسنے لگتا ہے۔ اسی طرح "پارٹیشن" میں انھوں نے مذہبی جنون کے مضحک پہلو کو اس طور پر پیش کیا ہے کہ قتل، کاریب انگیز پہلو دپ کر رہ گیا ہے۔ اس نظم میں شاعر نے ملک کی پارٹیشن کو جسم کی پارٹیشن ذکر دے اس کے دو ٹکڑے سے تشبیہ دے کر فن کا ایک لطیف نمونہ بھی پیش کیا ہے۔ فطرت کی طرف سے بعض لوگ سرت کی تقسیم پر مامور ہوتے ہیں اور وہ زندگی بھر روتی بسورتی ہوئی خلقت کے آنسو پونچھنے اور اسے ہنسانے کے مبارک کام میں مصروف رہتے ہیں حتیٰ کہ بعض اوقات وہ غم سے بھی اہل دنیا کے لئے تفریح کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور نکال لیتے ہیں۔ سماج ہمدی علی خاں کا شمار انہی لوگوں میں ہوتا چاہیے۔

راجہ ہمدی علی خاں "حال" کے شاعر ہیں۔ اور اسی لئے ان کی نظموں میں گوشت پوست کی زندگی سے ایک گہری وابستگی کے شواہد ملتے ہیں۔ ان کے ہاں اس زندگی اور اس کے ارضی پہلوؤں سے لطفت اندوز ہونے کا رجحان اس قدر توانا ہے کہ انھوں نے محبت، ازدواجی رفاقت اور وسیع تر زندگی

کی ناہمواریوں ہی سے خطا اٹھانے کی کوشش نہیں کی بلکہ ہر اس خیال کا مذاق بھی اڑایا ہے جو گوشت پوست کی اس زندگی اور اس کی بے ہمتیوں سے انسان کی نظریں ہٹا کر کسی خیالی جنت کی طرف مبذول کرتا ہے۔ چنانچہ ان کی نظموں کا ایک بہت بڑا حصہ جنت اور اس کی نضا سے متعلق ہے۔ وہ جب جنت کی ارفع اور پاکیزہ نضا میں سرت کی خالص ارضی کیفیت کو پیش کرتے ہیں تو سارا ماحول مضحکہ خیز نظر آنے لگتا ہے۔ راجہ صاحب نے اس ناہمواری سے بدرجہ اتم فائدہ اٹھایا ہے اور جنت کے ابدی روحانی کیفیت کو خالص ارضی سرت کی سطح پر لاکر ایک دل چسپ مزاحیہ تقابل کو جنم دیا ہے۔ ان نظموں کے مطالعہ سے شاعر کا انداز نظر بھی واضح ہوتا ہے۔ وہ مستقبل کی ابدی سرت کو شانہ طرز بنا کر گریا یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سرت کی نوعیت عارضی اور ہنگامی ہے اور اسی لئے اس کا بہت گہرا تعلق زمین سے ہے نہ کہ آسمان سے۔ دوسرے نظموں میں وہ مستقبل کے ابدی کیفیت پر حال کی عارضی سرت کو ترجیح دیتے ہیں اور یہی ان کا مطمح نظر ہے۔ جنت کے بارے میں کبھی گئی ان نظموں سے راجہ صاحب کا وہ ردِ عمل بھی واضح ہوتا ہے جو محبت، ازدواجی رفاقت اور وسیع تر زندگی کی ناہمواریوں کے پیش نظر پیدا ہوا تھا۔ یہ ردِ عمل ایک خوش باش صحت مند اور کھنڈر سے اڑنے والے کا ردِ عمل ہے۔ اور یہ اڑنے کا زندگی کی سرتوں میں حرکت کرنے کے لئے تیار ہے۔ چنانچہ راجہ ہمدی علی خاں کی جنت

دراصل اسکول سے باہر کی وہ دنیا ہے جس تک وہ اور اس کا ہم زاو۔
شیطان پہنچنا چاہتے ہیں۔ پس جب وہ جنت کی دیوار پر چڑھ کر جنت کے
اندر کی دنیا پر ایک نظر ڈالتے ہیں تو دراصل اسکول کی دیوار پر سے باہر
کی دنیا کو دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ فی الواقعہ جنت کے مظاہر کی طرف ان کا
سارا ذہن ایک شری لڑکے کا بند عمل ہے اور اسی لئے انہیں جنت کے
نظاہر سنجیدہ واقعات اور کرداروں کے بعض سنجیدہ اعمال میں مضحک پہلو
فی الفور نظر آجاتے ہیں، یہ ایک مثال قابل غور ہے:-

جنت کی دیوار پہ چڑھ کر میں اور شیطان دیکھ رہے تھے
جو نہ کبھی ہم نے دیکھا تھا ہو کہ حیراں دیکھ رہے تھے

وادی جنت کے باغوں میں اُن توبہ اک حشر پیا تھا
شیطان کے ہونٹوں پہ ہنسی تھی میرا کلیجہ کانپ رہا تھا

میں نہ کبھی بھولوں گا توبہ میں نے دیکھا جو نظارہ
"لعنت! لعنت! بول رہا تھا جنت کا ہر منظر پیارا

موٹی موٹی توندوں والے بد صورت بد ہیبت ملا

خوت زدہ خوردوں کے پیچھے بھاگ رہے تھے کہہ کے "ہا"

"میں اور شیطان دیکھ رہے تھے"

اس کے مقابلے میں جہنم یعنی اسکول کے اندر کا نقشہ دیکھئے جہاں
سے ایک "شری لڑکے" کے باہر نکال دئے جانے کا سارا منظر آنکھوں کے
سامنے آجاتا ہے۔

دشمنوں نے جب مجھ کو درخ میں بھینکا ڈسا مجھ کو اک سانپ نے پہلے آکر
پھر اک کانے پھونے "چٹکی میرے لی پھر ایک بھڑنے کا ٹانجھے مسکرا کر

جہنم کے ہلکے ہوئے باسیوں نے مجھے دیکھ کر تھمتے خوب مارے
چڑیلوں کے دادا یہ بھگتوں کے تانا لگے کہنے رکھسی طبیعت ہے پیارے

بھویں تن گئیں ریری غصے کے مارے کیا میری فطرت نے مجھ کو اشارا
جہنم کے ایک ایک باسی کو میں نے وہیں پر پھپھاڑا وہیں خوب مارا

اکھائی وہاں میں نے ایسی قیامت جہنم کے باسی جہنم سے بھاگے
میں لوہے کی لٹھ لے کے تھا پیچھے پیچھے وہ اکھڑے قدم لے کے تھے آگے آگے

گئیں ٹوٹ اُن نامرادوں کی مگر بہت اُن کی آنکھوں نے آنسو بہائے
ہر اک کہہ رہا تھا "بچاؤ بچاؤ" اسے مر گئے مر گئے ہائے ہائے!

جہنم کے لوگوں کی دیکھی یہ حالت توشاب کی لمبی کو رحم اُن پہ آیا
نکالو نکالو "اسے" جسد باہرا یہ کہہ کر جہنم سے مجھ کو بھاگایا

پہلو باد منٹو چلو کر کشن چندرا ! یہ کہہ کر وہاں سے ہوا میں روانہ
 ہمیں دور سے کر رہا تھا اشکے سر شام جنت کا موسم کہانا
 "جہنم میں غنڈے"

راجہ ہندی علی خاں نے جنت کا مذاق اڑا کر ہمیں اپنے تصور رات ،
 عقائد اور نظریات پر ایک تنقیدی نظر ڈالنے کی تحریک بھی دی ہے۔ بالعموم
 عقیدہ، تنقید اور تجزیے کا تحمل نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح نظریات اور تصورات
 کے سلسلے میں بھی آنکھیں بند کر کے ایک سیدھی پامال لیکچر پڑھے چلے جانے
 کا رجحان عام ہے۔ راجہ صاحب نے اپنی نظموں میں عقائد اور نظریات کے
 مضحک پہلوؤں کو پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ "دعا" "شیطان" "اشنان"
 "مریدان با صفا" وغیرہ نظموں میں ان کا یہ طریق کار بہت نمایاں ہے۔ اس
 سے جذباتی تشبیح کی کیفیت مدغم اور مرصعانہ سنجیدگی کا دباؤ کم ہوا ہے اور
 اس تشبیح اور دباؤ کے ہٹ جانے سے قاری کو ایک عجیب طرح کی فرحت
 نصیب ہوتی ہے۔ ماحول، زندگی اور عقیدے کو ایک نئے زاویے سے
 دیکھنے کا یہ رجحان آخر آخر میں ایک انوکھے روپ میں نمودار ہوا ہے۔ اس
 سلسلے میں یہ دو نظمیں خاص طور پر قابلِ غور ہیں:-

دیران تھا صحرا خاموش تھا دریا
 دریا کے کنارے سردی سے بھٹکتا

اک اور چھ کے ٹوپی چپ چاپ تھا بیٹھا
 کرسی کی لئے ٹیک
 کالا سا پہاڑ ایک

"گلاہ پوش"

اس پر بہت ہنستا ہوں میں
 میرے خداؤں تو ذرا
 یہ آسمان کا بلبلبہ
 کیوں تو نے ہم پر رکھ دیا!

"آسمان کا بلبلبہ"

یہ نظمیں اس بات پر وال ہیں کہ راجہ صاحب اپنے مخصوص زاویہ نگاہ کے
 تحت جب زندگی کے بے جان مظاہر اور کائنات کی پراسرار وسعت پر ایک
 نظر ڈالتے ہیں تو انہیں ساری دنیا ہی بے ڈھب اور مضحکہ خیز نظر آنے لگتی
 ہے۔ اور وہ اس کے "بے ڈھنگے پن" کا تصور کر کے بے اختیار مسکراتے لگتے
 ہیں۔ اس سے قاری کا جذباتی انہماگ کم ہوتا ہے اور وہ بھی شاعر کے ادیبانہ نگاہ
 کو اپنا کر بے جان مظاہر کی مضحکہ خیز صورتوں سے لطف اندوز ہونے لگتا ہے۔
 مسرت بہم پہنچانے کا یہ انوکھا انداز راجہ ہندی علی خاں سے خاص ہے اور اس
 خاص میدان میں ان کی حیثیت یقیناً منفرد اور بیکتا ہے۔ وزیر آغا

میری نظموں کا دوست

(۱)

میں نے اپنے حافظے پر بہت زور دیا ہے۔ بہت دور دور تک نظریں دوڑادی ہیں۔ تعجب ہے کہ اس وسیع و عریض دنیا میں مجھے اپنا کوئی دوست، کوئی ہم خیال، کوئی غیر خواہ نظر نہیں آیا۔ کوئی کتابلی تک مجھ سے ملنے نہ پاتا۔

لیکن میری نظموں کا کم از کم ایک دوست اس دنیا میں ضرور ہے۔ شاید اسی وجہ سے مجھے اپنی نظموں سے جلن سی ہوگئی ہے۔ یہ مجھے ایک آنکھ نہیں بھاتیں۔ اور میری دوسری آنکھ شاید ہے ہی نہیں۔ البتہ اپنی تیسری آنکھ سے میں نے اس دنیا پر چنا۔ اچھٹی ہوتی نگاہیں ضرور ڈالی ہیں اور بقدرِ ظرافت جو کچھ دیکھ سکا یا محسوس کر سکا، اُسے اکثر تانیے اور ردیف کے ساتھ اور کبھی کبھی اس کے بغیر بھی لکھ دیا ہے۔

میں اپنی "نظموں کے دوست" سے کبھی نہیں ملا۔ وہ یہاں سے بہت دور سرحد پار رہتا ہے۔ اپنی نظموں کے علاوہ میں اُس سے بھی جلتا ہوں، شاید اس لئے کہ وہ بھی ایک شاعر ہے۔ صرف شاعر ہونا کوئی اتنی بری بات نہ تھی، لیکن مصیبت یہ ہے کہ وہ مجھ سے بہتر شاعر ہے بات برداشت کرنے کی نہیں ہے۔ تاہم بادلِ ناخواستہ میں شاید اسے بھی رو دھو کر برداشت کر لیتا۔ لیکن جب اُس کے نظموں سے یہ حقیقت کسی عدالتِ عالیہ کے مستفانہ فیصلے کی طرح مجھ پر ثابت ہوگئی کہ وہ مجھ سے بہتر انسان بھی ہے تو معاملہ حدِ ضبط سے باہر ہو گیا۔ اپنی "نظموں کے دوست" کا یہ قصور میں کبھی معاف نہیں کر سکتا۔ اُس کے کیریکٹر کا اندازہ لگانے کے لئے صرف اتنی سی بات لکھ دینا کافی ہوگی۔ کہ وہ کسی بُری چیز کو "بُرا" کہنے کی بجائے مگر اچھا کہتا ہے۔ ظالم!

کتے ہوئے جی جلتا ہے لیکن حقیقت ہے کہ "میری نظموں کا دوست" ایک عظیم الشان نقاد ہے۔ ایک اعلیٰ پائے کا ادیب ہے اور شاعر ایسا کہ دیکھ کر رشک ہو، پڑھ کر جی بلے۔ شاعری کے ساتھ مصوری بھی کر جانتا ہے تاکہ آرٹ کی اس صنف میں بھی کسی دوسرے کے لئے جگہ نہ رہے۔ مصور تو سات جانے پہچانے رنگوں کی آمیزش سے تصویریں بناتے ہیں۔ یہ ان گنت رنگوں کی آمیزش سے اپنی نظموں کے پس منظر میں اور کبھی کبھی

لفظ لفظ کے پیچھے ایسی رنگارنگ تصویریں بنا دیتا ہے کہ پڑھنے والے دنگ رہ جاتے ہیں کہ وہ ان تصویروں کو دیکھیں یا ان نظموں کو پڑھیں، اس طرح اپنے شیداٹیوں کے لئے وہ باعث "مصیبت" بنا ہوا ہے۔ ادرا ب تو اس ظالم نے افسانے بھی لکھنے شروع کر دیے ہیں اور افسانے بھی ایسے کہ مجھ جیسا آدمی پڑھنے پر مجبور ہو جائے کہ

”وہ فتنے“ آدمی کی ”خانہ ویرانی کو کیا کم تھے؟“

جیسا کہ میں پہلے لکھ چکا ہوں، اپنی نظموں کے دوست سے میری ملاقات کبھی نہیں ہوئی۔ البتہ ان خطوں میں وہ اکثر مجھے دکھائی دیا ہے جو میرے خطوں کے جواب میں مجھے اکثر اس کی طرف سے موصول ہوتے رہے ہیں۔ انہی خطوں میں میں نے اُسے پڑھا بھی ہے مگر ہے وہ آپ کو ایسا دکھائی نہ دے جیسا کہ میں نے اُسے دیکھا ہے یا پایا ہے۔ لیکن آپ تو اُسے دونوں آنکھوں سے دیکھتے رہے ہوں گے۔ تیسری آنکھ سے آپ نے نہیں دیکھا ہوگا۔

اُس کی شاعری کی دنیا میں میری اکثر اُس سے ملاقات ہوئی ہے۔ اپنی دنیا کے تصور میں بھی میں نے بار بار اُسے دیکھا ہے۔ چاندنی راتوں میں پُر اسرار دشت پیمائی کرتے۔ گرجتے بادلوں کے نیچے بڑبڑاتے۔ جنگل میں بوڑھے درختوں سے دوستی کرتے۔ کھنڈروں میں آدھی رات کو ہواؤں

میں اپنے خیالات کے دئے جلاتے، اُداس و ادبوں میں تنہائیوں سے لڑتے جھگڑتے، سر بہ خیم آبتباروں کو اور بھی زیادہ خاکساری کی خاموش تعلقیں کرتے توں قزح کے پُل پر چڑھتے اور اترتے۔ ہر طرف کی ٹوپیاں اور بھٹے ”جیشی پہاڑوں“ سے تبادلہ خیالات کرتے، پختستان میں خوبصورت تیلیوں کو ٹوکتے۔

وہ ہماری دنیا سے بہت دُور اپنی دنیا میں رہتا ہے۔ اسے جنگلوں اور دیرانوں سے بہت محبت ہے۔ وہ جنگل میں کسی ندی کے کنارے یا کسی چٹنے پر یا کسی بارش بڑھے برگڑ کے تلے بیٹھ کر دنیا و مافیہا کو بھول جاتا ہے۔ جنگل کے پرندوں سے بے آزار سمجھ کر اس کے سامنے کبھی پیڑ پر اُبیٹتے ہیں۔ اُسے حیرت سے دیکھتے ہیں۔ اس پر رحم ”کھاتے ہیں اُسے اپنی طرف متوجہ کرنا چاہتے ہیں، جب وہ کسی طرح ان کی طرف متوجہ نہیں ہوتا تو وہ مارے غصے کے بطور گالی اُسے ”خاموش کہیں کا“! کہہ کر سرت کی تلاش میں کہیں دُور اُڑ جاتے ہیں۔ سفید خرگوش دے پاؤں اُس کے قریب آتے ہیں۔ شاعری کے بارے میں اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں قریب آکر ”فون فون“ کی آوازیں دگاتے ہیں۔ وہ بے حس و حرکت بیٹھا رہتا ہے تو وہ اُس کا ٹہنہ چڑا کر ”سرپٹ“ بھاگ جاتے ہیں۔ جنگل کے ہرن اپنے دوستوں کو اکٹھا کر کے پتوں اور ڈالیوں کی اوٹ لے کر اُس کے

قریب آجاتے ہیں اور اشارے ہی اشارے میں ایک دوسرے کو بتاتے ہیں۔ دیکھو! وہ بیٹھا ہے! وہ!!

اپنی "نظموں کے دوست" سے میری خط و کتابت ہمیشہ "کام کی باتوں" تک محدود رہی ہے۔ جب بھی میں نے اُسے ان حدود سے باہر لانا چاہا مجھے ناکامی ہوئی، خطوں میں ہزاروں کہ و زورں باتوں کا جواب نہایت صفائی سے گول کر جانا اس کا محبوب مشغلہ ہے۔ اُس کے بارے میں اگر کوئی بات معلوم کرتی ہے تو اُس سے نہیں پوچھتے اس کے لئے انہیں اُس کے پڑوسیوں سے خط و کتابت کرنی پڑتی ہے۔

اس ایک سال کے عرصے میں اُس کے بارے میں مجھے صرف اتنا معلوم ہو سکا ہے کہ وہ صبح ناشتہ کرتا ہے، دوپہر کو کھانا کھاتا ہے، چار بجے چائے پیتا ہے اور رات کو کھانا کھا کر سو جاتا ہے۔ بیٹے میں ایک بار ایڈیٹر "ادبی دنیا" سے طے اپنا شہر چھوڑ کر لاہور جاتا ہے۔ اُن سے کوئی بات کرتا ہے یا بغیر بات کئے واپس آ جاتا ہے۔ یہ بات ابھی تک مجھے معلوم نہیں ہو سکی، اُسی شام کی گاڑی سے واپس آ جاتا ہے۔ ٹرین میں کسی سے بات نہیں کرتا۔ اپنے ساتھ ایک ملازم رکھتا ہے۔ اگر کوئی اُسے سلام کرے تو نوکر اس کی طرف سے سلام کا جواب دے دیتا ہے۔ اگر کوئی اس بات پر حیرت زدہ ہو تو نوکر اُسے بتا دیتا ہے کہ "صاحب ذرا بات چیت کم کرتے ہیں۔ مجھے انہوں نے

اسی کام کے لئے نوکر رکھا ہے۔"

لاہور سے بہت دور وہ اپنے شہر کے ذراچ میں "شور و شر سے چھپ کر رہتا ہے۔ لیکن اینٹ پتھر کے مکان میں نہیں بلکہ تمانت اور سنجیدگی کی اونچی اونچی دیواریں اُس نے اپنے ارد گرد کھڑی کر رکھی ہیں۔ ان پر ازلی اور ابدی خاموشی کی چھت ہے۔ انگن میں بے خودی کے پھول کھلے ہیں۔ دیواروں پر جگہ جگہ نہ دکھائی دینے والی تصویریں آویزاں ہیں۔ ڈرائنگ روم میں فلسفہ اُس کا زینچر بن گیا ہے۔ گھر میں اس کے چاروں طرف جگہ جگہ "طاق ہائے نسیاں" ہیں۔ جہاں ہر وقت عجیب و غریب روشنیوں کے چراغ جلتے رہتے ہیں۔

آپ کچھ بھی کہیں مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ سال میں صرف ایک آدھ مرتبہ وہ بات کرتا ہے۔ جب خزاں آگے اُس سے پوچھتی ہے "میں جاؤں؟" تو وہ اثبات میں سر ہلا دیتا ہے۔ پھر بہار اپنی کسمی ادا میں گھسیٹتی بڑے ادب سے اُس کے پاس آ کر سلام کرتی ہے اور کہتی ہے "میں آؤں؟" تو وہ جواب میں مسکرا کر ہوا کا اشارہ کر دیتا ہے۔ عموماً سال میں اس کی یہ پہلی یا دوسری مسکراہٹ ہوتی ہے، اس کے بعد کوہ و بیاباں، دشت و جبل اور عین پھولوں سے بھر جاتے ہیں۔ کم از کم میں نے اسے یوں ہی دیکھا ہے۔ جس شخص سے آپ ملتے رہے ہیں۔ وہ اسی نام کا کوئی اور ہو گا۔

ایک مرتبہ اپنی "نظموں کے دوست" سے ملاقات کا شوق حد سے بڑھ گیا، تو چونکہ میری صحت پاکستان کا لمبا سفر کرنے کی اجازت نہیں دیتی تھی، میں نے خطوں میں وقتاً فوقتاً اس کا مزید تعارت کرنا چاہا۔ آخری خط میں مجھے اچھی طرح یاد ہے میں نے یہ بھی پوچھا تھا کہ نظم نگاری اور ادب نویسی کے علاوہ آپ کا شریفانہ شغل کون سا ہے؟ اللہ کی قسم خط کی ان تمام باتوں کا جواب تو تھا جو میری نظموں کے بارے میں تھیں، لیکن اس سوال کا جواب بالکل غائب تھا۔ میں بھی یہ سمجھ کر خاموش ہو گیا کہ "میری نظموں کا دوست" شاید کوئٹہ کی خفیہ تجارت کرتا ہو گا یا بردہ فروش ہو گا۔ کسی کے خفیہ بازار پوچھ کر اسے شرمندہ نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہے "میری نظموں کے دوست" کی مختصر ترین کہانی۔

(۲)

آپ یہ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اپنے متعلق یا اپنی نظموں کے متعلق کچھ کم لکھ رہا ہوں اور اپنی "نظموں کے دوست" کے متعلق زیادہ۔ ٹھیک ہے۔ لیکن آپ کو شاید یہ معلوم نہیں کہ اس وقت آپ میری جو نظموں پڑھنے والے ہیں یا پڑھ رہے ہیں۔ ان کا مصنف بھی میری "نظموں کا دوست" ہی ہے۔

میں نے اپنے ایک خط میں محض تفریحاً بڑی غیر سنجیدگی سے اپنی چند

نظموں مولانا صلاح الدین احمد صاحب کو بھیجی تھیں اور لکھا تھا "پڑھ کر چاک کر دیجئے۔ لیکن میری یہ نظموں شاید مولانا صلاح الدین نے "میری نظموں کے دوست" کو بھیج دیں اور اس کے بعد یہ سب گڑ بڑ شروع ہو گئی۔

میں نے اپنے اس خط میں "اپنی نظموں کے دوست" کا بھی ذکر کیا تھا اور ان سے پوچھا تھا کہ "وہ کون ہے؟ اس کا نام بڑا دلچسپ ہے۔ کیا وہ کوئی ایرانی ہے؟ مجھے اس کا نام مانٹ کر رہا ہے۔ میں اس شخص سے خط و کتابت کرنا چاہتا ہوں۔" اس زمانے میں میں اپنی نظموں کے دوست سے ناواقف تھا۔ اور اس کی ایک بھی نظم ادب کی دنیا سے لاکھوں میل دور ہونے کی وجہ سے اب تک میری نظموں سے نہیں گذری تھی۔

ایک دن بیکایک میرے نام میری "نظموں کے دوست" کا خط آ گیا۔ جس میں اس نے میری نظموں کی مبالغہ آمیز انداز میں بہت تعریف کی تھی۔ اگر مجھے اپنی نظموں کے دوست کی طرف سے یہ مبالغہ آمیز داد نہ ملتی اور مجھ پر اور لکھنے کے لئے زور نہ دیا جاتا تو مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا کہ مجھے بھی لکھنا چاہیے۔ مطلب یہ کہ نظموں میں نے نہیں لکھیں "بزدل شمشیر" مجھ سے لکھوائی گئی ہیں۔ اسی لئے میں اپنے موجودہ دور کی تمام نظموں کو اسی شاعر کی تخلیق سمجھتا ہوں۔ البتہ یہ بات اب تک میری سمجھ میں نہیں آسکی اور صدیوں تک نہیں آئے گی کہ تمارت اور سنجیدگی کے اس پہاڑ کو میری غیر سنجیدہ اور غیر شریفانہ نظموں کیوں پسند ہیں۔

میری نظموں کو مجھ سے کی صورت دینے کا ذمہ بھی میری نظموں کا دوست ہی ہے۔
 میں نے بہت سمجھایا تھا کہ ان نظموں کو مجھ سے کی صورت دے کہ پہلک کی دل آزاری
 نہ کی جائے۔ لیکن وہاں کون سنتا تھا، نخطوں میں جسے چھوٹا بھائی بنایا تھا، وہ اپنی
 سنجیدگی اور تانت کا رعب ڈال کر "بڑا بھائی" بن چکا تھا۔ لاکھ سمجھایا کہ دیکھو رعب
 ڈال کر "بڑا بھائی" بننے کی کوشش مت کرو۔ لیکن اس پٹھان کے سامنے اس اچوت
 کو ہار مانتی پڑی۔ راجپوتوں میں یہ بڑی کمزوری ہے کہ طاقت درادر بہادر ہونے کے
 باوجود آخر میں بیچارے ہار جاتے ہیں۔ اب میری یہ حالت ہے کہ میں اس عالم بڑش میں
 میں صرف دو ہی "ہستیوں" سے خائف ہوں، آسمان کے خدا سے اور زمین کے
 اس پٹھان سے —

اگر ان نظموں کو پڑھ کر خدا نخواستہ آپ مجھے داد دینا چاہیں تو اس داد کا مستحق
 بھی میری نظموں کا دوست ہے۔ اگر آپ مجھ پر سیداد کرنا چاہیں تو اس کی مستحق بھی
 یہی پُراسرار ہستی ہے۔ اگر آپ بیچارہ ہیں، آپ کو اور کوئی کام نہیں تو ذرا
 اسی شہر کا رخ کیجئے جہاں میری نظموں کا دوست "چھپ کر رہتا ہے"۔ آپ اسی
 کے مکان کے سامنے احتجاجی مظاہرے کیجئے اس کے خلاف مشاعرے برپا
 کیجئے، بغیر قانون کے نظلیں یا غزلیں لکھئے، قانونی یا غیر قانونی چارہ جوئی کیجئے جیسا
 بھی آپ کا ٹوڈ ہو۔ میری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

اگر کسی صاحب کو مجھ سے اس قیمت میں لہنگا سلوم ہو جو انہوں نے اس

کے خریدنے پر صرف کی ہے تو دام واپس کرنے کی ذمہ داری البتہ میں اپنے
 سر لیتا ہوں، یہ رقم آپ کبھی بھی لمبی میرے غریب خانے پر تشریف لا کر واپس
 طلب کر سکتے ہیں، لیکن یہ شرط صرف پاکستانی کریم فراؤں کے لئے ہے۔ ہندوستان
 والے مجھ پر بگڑنے کی بجائے، پاکستان جا کر میری نظموں کے دوست پر فوجداری
 کریں۔

اگر آپ اس کتاب کی قیمت واپس لینے کے لئے کسی وجہ سے لمبی تشریف
 نہ لاسکیں تو صبر کیجئے۔ اس کا اجراء کو آخرت میں ملے گا۔ لیکن اگر خدا نے آپ
 کو صبر کی دولت سے مالا مال نہیں کیا۔ اور آپ منغلطات پر اتر آنا چاہتے ہیں
 اور یہ منغلطات آپ مجھے تک پہنچائے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تو جس طرح شرفاء
 ہر قسم کی خط و کتابت اور ترسیل زر کا پتہ بھی درج کر دیا کرتے ہیں۔ میں نے بھی
 ایک شریف آدمی کی طرح ترسیل منغلطات کے لئے اپنا پورا پتہ نیچے درج کر
 دیا ہے۔

جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، میری نظموں کا اس دنیا میں صرف
 ایک دوست ہے۔ میری نظموں کو ایسا دوست کبھی نہیں ملے گا، حقیقت ہے کہ
 یہ نظلیں میں نے اسی کے لئے لکھی ہیں۔ جب اُس سے میرے تعلقات ختم ہو
 جائیں گے تو نظموں کا یہ سلسلہ بھی ختم ہو جائے گا۔ میری نظموں کی زندگی اور
 موت اسی کے ہاتھ میں ہے۔

طفل تسلیاں

جی چاہتا ہے کہ پاکستان جا کر اپنی نظموں کے اس دوست سے کبھی
ملوں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جو نہی میں اُس کے مکان پر جا کر دستک دوں گا
یا اندر اپنا وزیٹنگ کارڈ بھجوں گا وہ اپنے مکان کی پھلی دیوار میں جلدی سے
نقہ لگا کر کہیں جنگلوں میں بھاگ جائے گا۔

اچھا ہے کہ یہیں بیٹھ کر ہر روز اُس کے خط کا انتظار کیا کروں، جو
میری تاریک اور خاموش زندگی میں کبھی کبھی باغِ جنت کے چاند کی طرح طلوع
ہو کر مجھے ابدی مسرتوں کے طوفان میں بہا لے جاتا ہے۔

راجہ مہدی علی خاں

۲۵ جنوری ۱۹۶۱ء

۱۴۹۔ پالی روڈ۔ باندرہ۔ بمبئی ۵۰۔ بھارت

چور کی دعا

اے خالق ہر ارض و سما وقتِ دعا ہے
 بندے پر ترے آج عجب وقت پڑا ہے
 پہلے بھی ہر آفت سے مجھے تو نے بچایا
 دائم رہا مجھ پر تیرے الطاف کا سایا
 جب نام ترے کے کوئی نقب لگائی
 ہر کام کی تدبیر مجھے تو نے بھائی
 سچ تو یہ ہے کُتوں کو سلا رکھتا ہے تو ہی
 میرے لئے دروازہ کھلا رکھتا ہے تو ہی
 انصاف کے سچے سے مجھے تو نے چھڑایا
 اور دامِ حوالات میں اوروں کو پھنسایا

دل میں بہت ارمان لئے نکلا ہوں گھر سے

ایسا نہ ہونا کام میں لوگوں تیرے در سے

نامی کوئی ڈاکو نہیں چھوٹا سا ہوں اک چور

رحم آتا ہے بندوں پہ۔ بہت دل کا ہوں کمزور

مجھ سے کبھی گاڈ ریج کے تالے نہیں ٹوٹے

تیری ہی قسم میں نے کبھی بنک نہ ٹوٹے

چھ سات سو مل جائے تو بندے کو ہے کافی

وہ چور نہیں ہوں جو کرے وعدہ خلافی

اس چھت پہ کند اپنی میں پھینکیوں کا گھما کر

ہمت دے مجھے اتنی کہ چڑھ جاؤں میں فرزند

بسم اللہ! ارے واہ میں قربان! میں قربان!

کیا خوب لگی ہے کند! اللہ تیری شان



خرگوشوں کی غزل

کوئی شکاری بار بار بن میں ہمارے آئے کیوں؟
چونکیں گے ہم ہزار بار کوئی ہمیں ڈرائے کیوں؟
گھر نہیں، بھونپڑی نہیں، کٹیا نہیں، مکان نہیں؟
بیٹھے ہیں جنگلوں میں ہم کوئی ہمیں جگائے کیوں؟
کان کھڑے نہ کیوں کریں گھاس میں کہوٹں ہم چھپیں
کھٹکا ذرا بھی ہوا اگر کوئی ٹھٹکا نہ جائے کیوں؟
بن میں ہمارے جو بھی آئے، سیر مزے سے وہ کرے
آئے ہزار بار خود، کتوں کو ساتھ لائے کیوں؟
امی سے مار کھا کے بھی خوش کوئی کس طرح رہے
پانی مزے سے کیوں پیئے گھاس مزے سے کھائے کیوں؟

کتا کتا اک شکاری یہ آئیں گے ہم مزدوریاں

جس کو ہو اپنی جاں عزیز بن میں وہ گھرنائے کیوں؟

چڑیاں نہ چھپائیں کل، سوئیں گے ہم دوپہر تک

بند ہے بن کا دروازہ کوئی ہمیں جگائے کیوں؟



بی ہمسائی تو کیوں آئی تجھ کو شاید علم نہیں
یہ میرے پٹنے کا منظر ہے، کوئی اچھی فلم نہیں

تو ہر ایہ "میٹنی شو" کیوں دیکھتے آئی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے
چائے کی میز پر میں نے کچھ کچھ نقص نکالے فوڈ میں تھے
ہائے ری قسمت امی ابا دونوں ہی کچھ فوڈ میں تھے

بیٹھے بیٹھے اُن کو سوجھی میری بھلائی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے

تیرے حکم بنا اے داتا پتہ تک نہیں ہلتا ہے
میں تو جانوں تیرے ہی در سے مجھ کو سب کچھ ملتا ہے

تھینک یو اتھینک یو اتو نے کرائی میری ٹھکانی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے



چار بجے

بیٹھے بیٹھے، گوی گھر میں مار کٹائی، چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے

"اٹھی ہو گئیں سب تدریریں کچھ نہ" دعا نے کام کیا
امی اور ابا نے مل کر میرا کام تمام کیا

آج محلے بھر میں گونجی میری دُہائی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے

ناحق ہم مجبوروں پر یہ تہمت ہے سخت ساری کی
کتنی خوشی سے ہم نے اپنے پٹنے کی تیاری کی

سارے گھر میں ہم نے کیسی دھوم مچائی چار بجے
میرے بزرگوں نے مجھ کو تہذیب سکھائی چار بجے

گھر میں بیٹھے سادھویں کر اب علم کی مالا جلتے ہیں
ترگوٹوں کے پیچھے جھنگل میں کتوں کو بھگانا چھوڑ دیا

بہنوں میں بند جوڑتی تھیں وہ پھر سے اڑا دیں سب چڑیاں
مُغزوں میں صلح کرتے ہیں، مُغزوں کو لڑانا چھوڑ دیا

اب ہم نے کبھی کھانا کھا کر کپڑوں سے ہاتھ نہیں پونچھے
دیکھو کئی دن سے دھوبی نے رونا چپلاتا چھوڑ دیا

ہر ایک بغاوت چھوڑی ہے ہر ایک شرارت رخصت ہے
اب گھر میں فرشتے آتے ہیں شیطان نے آنا چھوڑ دیا

ہم سے پھر بھی ناراض ہو کیوں؟ کیا تم تسلی آئی ہو؟
اپنے ان پیارے بچوں کو اب منہ بھی لگانا چھوڑ دیا

جن آنکھوں میں روز شرارت تھی ان آنکھوں میں آنسو اب دیکھو
ان آپ کی پیاری آنکھوں کو اب ہم نے رُلانا چھوڑ دیا

ہے گھر کی فضا سہمی سہمی، غمگین ہیں بچوں کے چہرے
کب منہس کے کوگی اسے بچو کیوں ہم کو ستانا چھوڑ دیا؟

بچوں کی توبہ

ہم نے بکری کے بچوں کو کمروں میں سچانا چھوڑ دیا
ناراض نہ ہو امی، ہم نے، ہر شوق پُرانا چھوڑ دیا

ڈیڈی کے سوٹ پہن کر ہم صوفوں پر ڈانس نہیں کرتے
سارے گھر کی بیبادوں کو اب ہم نے ہلانا چھوڑ دیا

دادا ابا کا اب چشمہ بکرے کو نہیں پہناتے ہم
انا ابا کی لٹھیا کو اب ہم نے چھپانا چھوڑ دیا

بندر کو سہرا بانہ کے ہم دوٹھانہ بنائیں گے امی
اب گھونگٹ کا رُھ بنریا کو ڈولی میں بٹھانا چھوڑ دیا

ندیہ کے گھر سے پانی میں کھائے نہ کئی دن سے غوطے
گھر ہی میں پڑ سے اب لڑتے ہیں نہ یا یہ نہانا چھوڑ دیا

اب صبر کے بیٹھے بیٹھے پھیل آہیں بھر بھر کھاتے ہیں
مالن کو بنا بیٹھے خالہ، مالی کو رُلانا چھوڑ دیا،

نہنھی جو گن حنڈا کی تلاش میں

اے خدا جنگل میں چھپ کر تجھ سے ملنے آئی ہوں
 جیب میں تھوڑی مٹھائی بھی چھپا کر لائی ہوں
 تجھ کو کیا معلوم کتنا چاہتی ہوں میں تجھے
 تجھ کو تھوڑا دیکھ لوں تو چین آجائے مجھے
 آسماں پر میں نے دیکھا دور بینوں سے تجھے
 ڈھونڈتی پھرتی ہوں پونے دو ہفتوں سے تجھے
 آسماں پر چاند تاروں کے سوا کچھ بھی نہیں
 جنگلوں میں دیوداروں کے سوا کچھ بھی نہیں
 جھاڑیوں میں بھی نہیں ہے تو وہاں خرگوش ہیں
 تیری خاطر بن کے جوگی بن میں جو روپوش ہیں

میری امی باہر آجاتی ہیں برقع اور ٹھکر
 تو کبھی برقعے میں بھی آتا نہیں مجھ کو نظر
 آج کل پر وہ کوئی کرتا نہیں تیرے سوا،
 پھوڑنے والی ہیں اب امی بھی پر وہ خدا
 چوری چوری مجھ سے مل جائیں بہت ہی نیک ہوں
 امی کہتی ہیں کہ لاکھوں لٹکبوں میں ایک ہوں
 پورے پانچ آنے فیروز کو میں دے کر آئی ہوں
 ہاتھ میں چھوٹی سی اک تسبیح لے کر آئی ہوں
 تجھ کو خوش کرنے کی خاطر جھوٹ بھی نہ بولا آج
 کیا کروں جب اپنے سر پر رکھ لیا نیکی کا تاج
 جنگلوں میں آگئی سب اپنی گڑیاں پھوڑ کر
 میں تو جو گن بن گئی ہوں تجھ سے ناتے جوڑ کر
 چھپ کے امی سے وظیفہ بھی پڑھا کل رات کو
 تاکہ وہ سن لیں نہ تیری اور میری بات کو

سات راتیں "توبہ استغفار" بھی پڑھتی رہی
 آگے ہی آگے میں تیری راہ میں بڑھتی گئی
 ادھی روٹی کھائی ہے اور ساتھ بس تھوڑی سی بیاز
 آگئی ہوں بن میں لے کر اپنی ننھی "جانماز"
 اک اگر بتی بھی لائی ہوں ابھی سلگاؤں گی
 کر کے آنجھیں بند تیرے دھیان میں کھو جاؤنگی
 آنکھ میں آنسو ہیں اور تیرے لئے ہے دل اداس
 ابھی جا اب ابھی جا کوئی نہیں ہے اس پاس
 لگ رہا ہے ڈر مجھے جنگل بہت نڈسان ہے
 حوصلہ چھوٹا سا ہے، ننھی سی میری جان ہے
 دیکھ کر مجھ کو کسی بھیڑیا گر آگیا!
 اور اگر مجھ نگوڑی کو وہ ظالم کھا گیا
 دیکھ کر چھوٹی سی یہ تسبیح اور یہ "جانماز"
 توبہ روئے گا اے میرے خدائے بے نیاز

پھر یہ سب چیزیں ہری امی کو تو دے آئے گا
 کچھ نہیں تو تونہ سے بولے گا، تو روتا جائے گا،
 تجھ سے جب پوچھیں گی امی کیا ہو اجی کیا ہوا؟
 دیکھ کر امی کا چہرہ اتنا گھبرا یا ہوا
 تو نہیں یہ کہہ سکے گا تیری "بانو" مر گئی
 میری خاطر اپنی ماں کی گود حسالی کر گئی
 روئے گا پچھتا کے جب تو جنگلوں میں بار بار
 بھیڑیے کے پیٹ میں روؤں گی میں بھی زارتار
 کیسے پونچھوں گی تیرے آنسو بہت گھبراؤں گی
 تو بلائے گا، مگر کیسے میں باہر آؤں گی
 اپنی اتنا چاہنے والی کو مت برباد کر
 آسمانوں سے اتر کر اب میرا دل شاد کر
 گر نہیں آتا تو پھر اک کام کر دینا مرا
 یہ ضروری کام ہے مت بھول جانا اے خدا

محترمہ مسز اولو اور ان کے بچے

(۱)

امی، میں اور بھتیجا کل ایک شاخ یہ بلیٹے اُدنگھر رہے تھے
باغ کی بھینتی بھینتی خوشبو، چونچ سے اپنی سونگھ رہے تھے
ہم پر سینے پھینک رہا تھا۔ دُور سے سورج کالا کالا
آدھے سوئے تھے آدھے جاگے، دُور ابھی تھارین اُجیالا
اتنے میں اس پیر کے نیچے، آئے دو اسکول کے بچے
ایک اشارا کر کے بولا "دیکھو دو اُو کے پٹھے"
اُن کی گالی سُن کر امی، رونے لگے ہم دونوں بھائی
بھاگ گئے "وہ دونوں" ڈر کر ہم نے ایسی راڑ مچائی

جب تجھے فرصت ملے امی سے کہہ آنا کبھی
تھوڑی سی بر فی منگا کر نیاز دلوادے مری
اور فرشتوں سے بھی کہہ دینا میرے اچھے خدا
میرا نام اس چھو کری نے آ کے جنگل میں لیا
بھیریے کے پیٹ سے جنت میں لے جانا اسے
بھول سے دھوکے سے دوزخ میں نہ پھینک آنا اسے



عہدِ جوانی منس منس کاٹا

اپنی گول آنکھوں سے امی، ہم کوئی دوسوا آنسو روئے
ادڑھ کے سپنوں والی چادر، اٹو، پتو۔ آج نہ سوئے
امی! بابا تو کہتے تھے۔ ہم دونوں اچھے بچے ہیں،
پھر وہ بچے کیوں کہتے ہیں ہم دو اٹو کے پٹھے ہیں؟

(۲)

دو ادھر اے پیارے بچو! ماں تم پر اپنی جاں دے لے!
پوچھ لو اپنی گول آنکھوں سے، لمبے لمبے آنسو پیارے
سچ کہتی ہوں تم دونوں ہو۔ ایک حسین اٹو کے بچے
تم کو جو آ کر دے گئے گالی۔ وہ ہوں گے اٹو کے پٹھے!



آذرا کوٹھے پہ جائیں

آدھیں چٹری سکھائیں

اُس تگورے مردوسے کو منہ لگائیں گے نہ ہم

وہ جدھر ہوگا ادھر چٹری سکھائیں گے نہ ہم



تگورے

توہی جا کوٹھے پہ سوسن میں تو بس اب جا چکی

تو بہ تو بہ کون واں جلے گا میں باز آچسکی

جب بھی میں اُدپرہوں جاتی

سامنے اُس کو ہوں پانی

وہ تگورے مجھ کو تک کر جانے کیوں کہتا ہے "ہائے"

اب کہو سوسن کوئی کیا خاک اس کوٹھے پہ جلے

دس دفعہ میں کل گئی جب

کیا تباہوں اُت مرے رب

دس دفعہ ہی میں نے پایا اُس کو اپنے سامنے

مجھ کو تک تک کر لگا کم نخت دل کو تھامنے

پھول اور کانٹا

جھپٹے کے وقت شیشم کے درختوں کے تلے
 بل رہی تھی جب ہوا مسرور شاخوں سے گلے
 جب زمین خلد منظر کیفیت سے معمور تھی
 شام کی دیوی محبت کے نشے میں چور تھی
 شہر کی ویراں سڑک پر مجھ کو اک لڑکی ملی
 نیلگوں بلبوس میں مورت چھپی ممتی نور کی
 ساتھ اپنے دھول اڑائے جس طرح بوج ہوا
 جس طرح سے پھول کے ساتھ ایک کانٹا ہو گا
 تمام کراس مر لقا کا عطر سے آلودہ ہاتھ
 نوجواں بھی آ رہا تھا ایک اس کے ساتھ ساتھ

بنتِ عم

لڑکا:۔ نہیں آتی تو کیا ہے، ہم تمہیں انگلش پڑھا دیں گے
 کتابیں مت مڑگانا، سب کی سب ہم گل ہی لادیں گے
 لڑکی:۔ نہیں اس کی ضرورت کیا ہے، یہ تکلیف مت کیجے
 مناسب ہے یہی، بی۔ اے کا پہلے امتحان دیجے
 لڑکا:۔ کسی کی منکر میں کیوں آ رہے تم کو پسینے ہیں؟
 ابھی تو امتحان میں ٹھیک پونے نوہینے ہیں
 لڑکی:۔ جی ہاں یہ ٹھیک ہے لیکن مجھے ڈیڈی پڑھا دیں گے
 وہ کل ہی کہہ رہے تھے سب کتابیں مجھ کو لادیں گے
 لڑکا:۔ انہیں فرصت کہاں ہے، کیوں انہیں تکلیف دیتی ہو؟
 میں جب کتابوں تم کوئی بہانہ ڈھونڈ لیتی ہو

لڑکی :- بہت رہتی ہے جینم دھاڑ سب بچوں کی اس گھر میں
 پڑھے گا خاک کوئی اتنا داو بلا ہو جس گھر میں
 لڑکا :- ارے ہر شام کنج باغ میں ہم بیٹھ جائیں گے
 اٹھے آنا ہی یا طوقاں ہم تمہیں انگلش پڑھائیں گے
 لڑکی :- اجی پھوڑو یہ باتیں اپنا دل تم کر چکے ہو گم
 کو ناصاف! مجھ سے عشق کرنا چاہتے ہو تم!



دردن اور لارڈ کرزن

سرور :- ادھر دیکھئے اک نظر بندہ پرورد
 کہ ملنے کو تشریف لائے ہیں سرور
 ذرا اپنے چہرے سے زلفیں ہٹا کر
 ہمیں دیکھئے اک نظر مٹا کر
 یہ "دیوانِ غالب" یہ دیوانِ حالی
 یہ ہے داستان "امامِ غزالی"
 تلاشِ ان کی کرتا رہا ہوں مہینوں
 بڑی مشکلوں سے ملی ہیں یہ تینوں
 میں بارش میں بھی آج پھرتا رہا ہوں
 میں کچھ نہیں سڑکوں پہ گرتا رہا ہوں

وہ محبتوں کبھی کیٹھن کام کرتا
 کہ وہ ایسے موسم میں آرام کرتا
 مگر میں پر رنج محبت جب ملا کہ
 انہیں ڈھونڈ لایا افریڈوں میں جا کر
 بس اب مجھ سے تم "شکر یہ سگنہ کہنا
 اسی طرح بے درد خاموش رہتا
 جب آیا انہیں گھر میں مصروف دیکھا
 انہیں "دفتر دل" سے "موقوف" دیکھا
 مٹینوں پہ کپڑے سٹے جا رہے ہیں
 رومالوں پہ بچنے کئے جا رہے ہیں

جہیز اپنا سینا اری اے سینا
 مگر میرا چاک گریباں نہ سینا
 ارے اس مٹین کو میں کھڑکی سے پھینکوں
 ہوئی کتنے ٹکڑے؟ میں اوپر کر دیکھوں

یہ "ڈر کوپ" ہے اور ڈرپوک ہوں میں
 مگر پینک دینے پہ پردہ دکھوں میں
 ہنساتا ہوں تم کو تو ہنستی نہیں ہو
 پھنساتا ہوں تم کو تو پھنستی نہیں ہو
 ارے میرے اللہ بڑی ہے یہ بچی
 نہیں چل سکے گی محبت کی چسکی
 نگاہیں اٹھا کر ادھر دیکھ درزن
 کھڑا ہے تیرے سامنے لاد کر زن



رضیہ :- چلو بھوڑو مسٹر یہ بکو اس کب تک
 تم اس گھر میں توڑ پوڑے بے اس کب تک
 کبھی لڑکیاں ایسے پھنستی نہیں ہیں
 ہنساؤ تو بے درد ہنستی نہیں ہیں

چلے آئے پھر عشق کا سارے کر
بلاؤں میں امی کو آواز دے کر؟
امی دیکھے یہ

سرور:-
مے مے خاموش خاموش بس بس

ابھی بس ابھی جا رہا ہوں میں واپس
میرے عشق کو پاؤں سے تم رکھ دو
مگر ان کتابوں کی "قیمت" تو دے دو
مگر یاد رکھو کہ قیمت بڑی ہے
ہے برکھا کا موسم بلن کی گھڑی ہے

رضیہ:-
یہ برکھا کا موسم جہنم میں جائے

نہ "شیطان" کوئی میری جنت میں کئے
مجھے یاد ہے کل درختوں کے پیچھے
گھنی "عشق بیجاں" کی بیلوں کے نیچے

بڑا ہے محبت میں ڈائریکٹ ہونا
پسند آئے بھی ایسے ریکٹ ہونا
یہ کرے میں کتنی ہوا آ رہی ہے

یہ زلفوں کو بیکار اُجھار ہی ہے
کہو تو میں کھڑکی کا پردہ گرا دوں؟

قرب آئے چہرے سے زلفیں ہٹا دو؟
یہ کینت کتنا اُجھتی ہیں تجھ سے

اُجھنا یہ تجھ سے اُجھنا ہے مجھ سے
چلنا رہوں کب تک دور رہ کے

قرب آؤں ہیں ایک دہین کہہ کے؟



رضیہ:-
کم از کم رہو سو قدم دور مجھ سے

چپت در نہ کھاؤ گے بھر پور مجھ سے

بھائی بہن

لے کے اپنی اداؤں کے لشکر وہ بے پاؤں گھر سے آتی ہے
چاند جیر سے اُس کو نکلتا ہے سوچتا ہے کہ ہر یہ جباتی ہے

گلستاں کی حبیبیں ہواؤں میں اس کی ہر اک مراد کھلتی ہے
دن میں کہتی ہے جس کو وہ بھائی رات کو چھپ کر اُس سے ملتی ہے



یا تقام جب تم نے اک ہاتھ میرا
تسا یا بہت، مجھ کو جی بھر کے پھیرا،
بہت کچھ تمہیں پیشگی دے چکی ہوں
نہ پھر مانگنے کی قسم لے چکی ہوں
لئے اپنا دل بھاگ جا لارڈ کر زن
نہیں تو تمہیں پیٹ دے گی یہ درزن



آخری گالی

پھر وہی پھیریں پیار کی باتیں آپ نہیں باز آئیں گے؟
دیکھئے ہم اٹھ کر چل دیں گے، آپ نہیں گر جائیں گے
تو بس قزح چولہے میں جلے کالی گھٹا کو آگ لگے
کیا ہم دیکھ نہیں سکتے ہیں؟ آپ ہمیں دکھلائیں گے؟
آنکھیں ہماری اچھی ہیں تو آپ کو ان سے کیا مطلب
جلسی بھی ہیں آپ اب ان کے پیچھے ہی پڑ جائیں گے؟
آپ نے تصویریں مانگی تھیں ہم نے بس یوں ہی دے دیں
کیا معلوم تھا آپ اب ان سے دل کا عمل سجا لیں گے
بڑی بڑی نظریں چہرے پر ڈال رہے ہیں اُفت تو بہ!
ہم اپنے دونوں گالوں کو جا کے ابھی دھو آئیں گے

فیصلہ

محبت کروں تجھ سے میں اے حسینہ؟
مگر میری صورت کچھ اچھی نہیں ہے
یہی سوچتا ہوں کہ وہ پھر بھی کوشش
مگر تیری صورت کچھ اچھی نہیں ہے
چلو پھیر لیں اپنی اپنی نگاہیں
نہ تم ہم کو چاہو نہ ہم تم کو چاہیں



اتنے لمبے لمبے خط ہم کیسے پڑھیں ہائے اللہ،
 جب بھی آئیں گے ساتھ اپنے کوئی مصیبت لائیں گے
 ہم پر آپ نے نظیں لکھ دیں، اس پر بھی ہم خاموش رہے
 نظموں کے بعد آپ تو ہم پر نثر بھی اب چپکائیں گے
 یہ جھکے، یہ سینٹ، یہ نظیں عشق کا سب سا زور سماں
 اب واپس لے جائیے صاحب بس میں نہیں ہم آئیں گے
 ہم کہتے ہیں شہر میں ہوں گی نو سو لڑکیاں کم سے کم
 یہ کیا ضد ہے پیار کی مالا ہم ہی کو پستائیں گے
 کر لیجے رضیہ سے محبت ہم پر کیجے نظرِ کرم
 وہ بیچاری پھنس جائے گی ہم اس کو سمجھائیں گے
 عظمت بھی اچھی خاصی ہے اس سے لڑائی لے آئیں
 آپ اس بندہ کی خاطر کب تک رحمت فرمائیں گے
 خال صاحب آتے ہیں تو کیسے کہیں ہم "مت آؤ"
 آتے ہیں تو ہم کیوں روکیں کھا تو نہیں وہ جائیں گے

دیکھئے ہاتھ لگایا تو ہم ڈر کر شور مچا دیں گے
 امی، ابا، پھپھو، خالہ، دوڑ کے سب آجائیں گے
 پہلے ہم کو بہن کہا۔ اب فکر ہمیں سے شادی کی
 یہ بھی نہ سوچا بہن سے شادی کر کے کیا کہلائیں گے؟



پردہ اُس نے چھوڑ دیا ہے
بُرقعہ اُس کا دُور گر ہے

چہرے پہ خوشبودار پسینہ
اُلٹے سڑ جو بن، باغی سینہ

گوری گوری چنچیل باہیں،
وصل کی خواہاں شوخ نگاہیں

سر پر لاکر ہاتھ حستانی
لے کر اک دل چینک انگریزی

کہتی ہے "چھوڑو قاضی و اصنی
میں بھی راضی، تم بھی راضی؟"



مولوی صاحب کا خواب

دیکھائیں نے جس کو چھپ کے
اپنے جسے کی کھڑکی سے

جس کے لئے تعویذ کرائے
ندی نالوں میں ڈلوائے

اُس کے گھر میں جا پہنچا ہوں
باکل اُس کے پاس کھڑا ہوں

گھر میں بیٹھی ہے وہ اکیلی
ماں ہے پاس، نہ کوئی سہیلی

ادیب کی محبوبہ

تمہاری اُلفت میں ہارو تم پر میری غزلیں گارہا ہوں
 بہتر ان میں چھپے ہیں نشتر جو سب کے سب آزارہا ہوں
 بہت دنوں سے تمہارے جلوے خدیجہ مستور ہو گئے تھے
 ہے شکر باری کہ سامنے اپنے آج پھر تم کو پا رہا ہوں
 بحان عصمت کا اور تم نے فسانے منٹو کے پڑھ رہی ہو
 پہن کے بیدی کا "گرم کوٹ" آج تم سے آنکھیں ملارہا ہوں
 تمہارے گھرن ہم ہر اشد کالے کے آیا سفارش سی خط
 مگر تعجب ہے پھر بھی تم سے نہیں میں کچھ فیض پارہا ہوں
 بہت سے بیدھی سی بات میری بجانے تم کیوں نہیں سمجھتیں
 قسم خدا کی کلام غالب نہیں میں تم کو ستارہا ہوں

تمہاری زلفت سیہ پہ نقیب کس سے لکھواؤں تم ہی بولو
 بشری عبادت بریلوی کو میں تارو سے کر بلا رہا ہوں
 میں تم پہ ہوں جاں نثار اختر قسم ہے منشی فدا علی کی
 بہت دنوں سے میں تم پہ ساغر سے جادو ٹونے کر رہا ہوں
 اگر ہو تم ہاجرہ تو پھر مجھ سے مل کے مسرور کیوں نہیں ہو؟
 تمہارے آگے اُوپندرنا تھا شکابین کے آنسو بہا رہا ہوں
 جیسے ہوزہرہ جمال ہو تم، مجھے ستا کر نہال ہو تم
 تمہارے یہ ظلم تشریح العین کو تہانے میں جا رہا ہوں
 میری محبت کی داستان سن کے رو پڑے جوش ملیحانی
 ٹکھا کے پنکھے سے اُن کے آنسو ابھی دہاں سے آ رہا ہوں
 پلا دو آنکھوں سے تاکہ مجھ کو کچھ آل احمد سرور آئے
 بہت ہیں غم مجھ کو عاشقی کے پیسے بناؤ گنگا رہا ہوں
 میری تباہی پہ چھاپ دیں گے نقوش کا ایک خاص نمبر
 طفیل صاحب کے پاس سارے مسودے لے کے جا رہا ہوں

وزیر آغا پٹھان ہیں ساتھ ساتھ یاروں کے یار بھی ہیں

پاکر کے وہ تم کو پیٹ دیں گے، میں کل اتنی ساتھ لا رہا ہوں
حکیم یوسف حسن نے جب میری نہیں دیکھی تو رو کے بولے

جگرے زخمی تباہ گردے یہ بات تم سے چھپا رہا ہوں

یہ صبح آباد آج جا رہا ہوں میں جوش لاؤں کہ آم لاؤں؟

ہیں دونوں چیزیں وہاں کی اچھی ہیں لاؤں کیا تملار ہوں

جو حکم دو واجدہ تبسم کا کچھ تبسم میں تم کو لا دوں

تھارے ہونٹوں پہ غم کی موجوں کو دیکھ کر تملار ہوں

فسانہ محقق مختصر ہے، تم حُدا کی نہ پور ہونا

فراق گور کھپوری کی غزلیں نہیں میں تم کو سنار ہوں

میری محبت کی داستاں کو گدھے کی مت سرگزشت سمجھو

میں کرشن چندر نہیں ہوں ظالم نقیب تم کو دلار ہوں!



ضرورت رشتہ اور تصویریں

(۱)

مئی اُس سے نہیں، توبہ! کروں گی قدر خاک اس کی

مجھے لگتا ہے ڈراما سے بہت لمبی ہے ناک اس کی

ہوئی شادی تو پہلا کام، میں ڈائی دورس مانگوں گی

میں اُس کی ناک پر کیا اپنا اور کوٹ مانگوں گی

نہیں بابا، نہیں بابا،

(۲)

یہ آپکن پہنے بیٹھے ہیں غلط بولیں گے انگریزی

ہلا کو جیسی نہ نکھیں ہیں نگاہیں ان کی چٹنگیزی

میں کوئی ملک ہوں جو مجھ پہ حملہ کرنے آئے ہو

میاں جادو۔ میں اک تلوار ہوں کیوں مرنے آئے ہو
نہیں چھتے، نہیں چھتے۔

(۳)

”وٹامن بی“ کی کچھ اس میں کمی معلوم ہوتی ہے
میرے اللہ نرض اس کی حکمت معلوم ہوتی ہے

میں بیٹ کرتی ہوں امی ہوگا یہ بیمار برسوں سے
بچار امپٹن ہوگا کم از کم چار برسوں سے
نہیں امی، نہیں امی۔

(۴)

بہت خط اس نے بھیجے ایک بھی بھیجا نہ تو لیٹر
میں پھیلے دیک اس سے کر چکی ہوں ڈراپ یہ میٹر

میاں تم مشرقی اور مغربی ہے حساندان اپنا
میں باز آئی محبت سے اٹھا لو پاندان اپنا
نہیں جنتے، نہیں جنتے

(۵)

مٹی غنڈہ ہے یہ اور نام ہے بی اے شریف اس کا
شراب اور بد معاشی میں نہیں کوئی حریت اس کا

ادھر یہ ڈال کر ڈورے مجھے اپنا بنالے گا
ہو تم بھی خوبصورت، یہ نظر تم پر بھی ڈالے گا
اری لڑکی۔ اری لڑکی۔

(۶)

بنکا ہیں بیچی بیچی نام ہے ایم۔ اے لطیف اس کا
خایا تو یہ تو یہ جسم ہے کتنا نجیف اس کا

میری نظروں کا پہلا تیر بھی یہ سہنہ نہیں سکتا
یہ مر جائے گا بیچارہ یہ زندہ رہ نہیں سکتا
چلو آگے، چلو آگے،

(۷)

یہ اس کے منہ پہ مٹر ڈر پھٹے منہ کس نے لکھ ڈالا؟
یہ میرا کام تھا لیکن شرارت کر گئی خالہ

ذرا ٹھیرو میں اس کے ساتھ خالہ کو پھیناؤں گی
اسی خالہ کو "بیگم ڈر پھٹے مُنہ" میں بتاؤں گی
"اری لڑکی - اری لڑکی"

(۸)

یہ ایل ایل بی ہے پر اللہ بچائے ان و کیلوں سے
یہ ہر اک بات منوالے کا تانوتی دلیلوں سے
مجھے ڈانی دوسرے یہ بائی فورس سے سکتا ہے جیلوں سے
یہ اگھر لوٹ لے گا قریبوں سے اور اپیلوں سے
نہیں دیکھو، پرے پھینکو۔

(۹)

یہ شاعر ہے یہ ہر لڑکی کو آہیں بھر کے تکتا ہے
جب اگتا جلتے گا کہہ دے گا "میڈم تجھ میں سکتا ہے"
کرے گا شاعری دن بھر نہیں پیسہ کمائے گا
یہ بھوکا رہ کے راتوں کو گرہ مجھ پر لگائے گا
نہیں امی - نہیں امی۔

(۱۰)

ارے یہ ڈاکٹر نبضیں حسینوں کی ٹوٹے گا
گئے گا دھڑکنیں دل کی، گریبانوں کو کھولے گا

شریکِ زندگی بن کر میں جینے کو توجی لوں گی
جو اس پر شک ہو میں ٹنگچر آلو ڈین پی لوں گی
نہیں بابا، نہیں بابا

(۱۱)

مٹی اب بس کرو بس بس غلط ہیں سب یہ تدبیریں
محبت میں نہ کام آتیں ہیں تصویریں نہ تقریریں!
جو پچ پوچھو شراب عشق سب کتنی رہی ہوں میں
وہی اچھا ہے جس سے کورٹ شپ کتنی رہی ہوں میں
بہت اچھا
بہت اچھا

○

(۳)

عدالت حسن کی ہے، میں کے مجسٹریٹ بھیجی ہیں
یہ شادی کے لئے "ملازم" کو دینے ڈیٹ بھیجی ہیں
چھوٹا ان کو تو بولیں گی "رذالت کر رہے مومتم
پر سے ہرٹ جاؤ تو ہیں عدالت کر رہے مومتم
نہیں امی نہیں امی

(۴)

تمی کیا یہ وہی ہے جس کی تم ہو عاشق و شیدا
یہ ہندی ہو کے کیوں انگلینڈ میں جا کر ہوئی پیدا
سوئٹزر لینڈ میں ہے باپ امریکہ میں ماں اس کی
"چمن" میں ہر طرف بکھری ہوئی ہے داستان اسکی
نہیں امی نہیں امی

(۵)

بھویں تنہی ہیں کتا ساتھ میں ہے تن کے بھیجی ہیں
کلام داغ شاید پڑھ کے یہ بن سٹن کے بھیجی ہیں

ایک اور ضرورت لاشہ اور تصویریں

(۱)

پولیس کپتان کی پوتی ہے یہ۔ اس سے نہیں امی
جہاں ڈانٹا، پولیس آجائے گی فوراً وہیں امی
"فون فون" کیا تو اپنے ڈیڈی کو بتا دے گی
یہ خود باہر رہے گی اور مجھے اندر کر دے گی
نہیں امی نہیں امی

(۲)

تمی یہ وہ ہے جو پٹنے میں ہا کی بیج کھلی تھی
خوشی سے شیخ کی موٹر میں اس نے لفٹ لی تھی
وہ اس گوری پہ کالا ہاتھ اپنا دھر چکا ہوگا
وہ موقع پا کے موٹر میں اسے کس کہ چکا ہوگا
نہیں امی نہیں امی

کہیں گی میرے کتے کے لئے بھی پارٹز لاؤ

کسی کانسر ادا کی "دید" سے اس کو بھی بہلاؤ
نہیں امی، نہیں امی

(۶)
سنا ہے فلم میں بھی یہ جینتہ کام کرتی ہے

نہ جانے ایک دن میں کتنے دل نیلام کرتی ہے
جو میرا دل گیا کوئی مجھے ولین بنا دے گی

یہ دو ہی چار سینوں میں مجھے گھر سے بھگا دیگی
نہیں امی، نہیں امی

(۷)

ارے اس کو تو اس دن پارٹی میں ہم نے دیکھا تھا

کسی لڑکے نے اس پر دُور سے اک پھول پھینکا تھا

یہی تھے ٹاپس کانوں میں یہی ٹیشو کی ساری تھی

نظر سے بچا کر اس نے مجھ کو آکھ ماری تھی

نہیں امی، نہیں امی

ہے ریٹ ہاتھ میں، کیا بیڈ منٹن اس نے ٹیکھی ہے

تتیا مرچ کی مانت کتنی ٹیکھی ٹیکھی ہے

اسی ریٹ سے اک دن میرا قصہ پاک کر دے گی

یہ میرے عشق کو دو دن میں ٹیل کاک کر دے گی

نہیں امی، نہیں امی

(۹)

دکن کی جادو گرنی آئی دام زلف کو کھولے

کے "قینچی" کو "خینچی" اور "قسم" کو یہ "خضم" بولے

قسم کھانے کے دھوکے میں "خضم" شاید یہ کھا جائے

میری امی جوانی میں نہ مجھ کو موت آجائے

نہیں امی، نہیں امی

(۱۰)

منا ہے فن موسیقی میں ماہر ہے یہ نیک ابلا

کے گی مجھ سے "میں گاؤں گی تم پھیڑو ذرا طبل"

میرے گھر کی چھتیں اڑھائیں گی سب اسکی تانوں سے

نہ سارنگی جدا میں کر سکوں گا اس کی رانوں سے

نہیں امی، نہیں امی

(۱۱)

نغزالی آنکھ، چہرہ پھول، شرمیلی نظر اس کی

حصیں گالوں پر دو دو تل ہیں اور غائب کرا سکی

مٹی یہ سروت لڑکی نہیں میرے نصیبوں میں

یہ بٹ جائے گی فوراً شاعروں میں اور ادیبوں میں

نہیں امی، نہیں امی

(۱۲)

کھڑی ہے ریگ ساحل پر۔ امیرا بھر کی پوتی

صراحی دار گردن میں ہیں کچھ مرجان، کچھ موتی

میرے دل کے سینے کو چٹانوں سے نہ ٹکرائے

کسی ملاح سے مجھ کو سمندر میں نہ پھکوادے

نہیں امی، نہیں امی

(۱۳)

مٹی اب تو سمندر ہی میں پھینک آؤ یہ تصویریں

نہیں ڈالو میرے قدموں میں تم شادی کی زنجیریں

جو سچ پوچھو۔ یہ سب شادی نہ کرنے کے بہانے ہیں

چھلنا تیر ہوں سب لڑکیاں میرے نشانے ہیں

مجھے دنیا کی ہر لڑکی حب میں معلوم ہوتی ہے

ہر اک صورت مجھے سحر آفرین معلوم ہوتی ہے

اگر ان لڑکیوں میں ایک سے شادی کروں گا میں

یقین ہے مجھ کو، باقی کے لئے آہیں بھرنے لگیں

کہو اب تم ہی امی میں کرونگا کس طرح شادی

میں ڈیڑی کی طرح ہرگز "تقاعدت" کا نہیں عادی

"ارے بڑے ارے بڑے"

○

تاش کے پتے پھینکویارو تاش کے پتے پھینکویار

سینے کا گلزار کھلاتی

ڈوالی کی سی مگر لچکاتی

آج تو آتی ہے وہ ایسی

ساتھ نہیں ہو اسکی سہیلی

کیوں بے نیلی اونگھ رہے؟

اُس کی خوشبو سونگھ رہے؟

جب وہ آئے کہہ کے "ہائے" آنکھ تو اُس کو مار

تاش کے پتے پھینکویارو تاش کے پتے پھینکویار



غندڑے

تاش کے پتے پھینکویارو تاش کے پتے پھینکویار

سامنے دیکھو کون آتی ہے کر کے سات سنگار

تاش کے پتے پھینکویارو تاش کے پتے پھینکویار

پہچانا ہے کون حسینہ؟

تھام لو اپنا اپنا سینہ!

لنگڑے سیدھ کی یار آتی ہے

ہفتے میں دو بار آتی ہے

چوڑیوں کی جھنکار سُناتی

پانلیا کے گیت سُناتی

آتی یہ ہر بار ہے یارو کر کے سات سنگار

اس بڑک پر اس آنکھ نے دیکھا
چلبلی پیاری اک حسینہ کو
آجا کر بیٹے ادھر ذرا کہہ کے
مار دی آنکھ اس لعینہ کو

اپنے گورے سے ہاتھ کا تھپڑ
میرے منہ پر جما دیا اس نے
یوں لگا جیسے گرم اک بوسہ
میرے منہ پر لگا دیا اس نے

اُس حسین ہاتھ کی حسین خوشبو
اب بھی آتی ہے سونگھ لیتا ہوں
دو گھڑی بند کر کے میں آنکھیں
اپنے تانگے میں اونگھ لیتا ہوں

اور کیا چاہیے تھا بابو جی



ایک آنکھ والا

اے کے بڑی کا ایک بلاکش
تائنگے والا میرا لگا کہنے
ایک چابک لگا کے گھوٹے کو
دیکھ کر اک حسین جوڑے کو

بابو جی ایک دن کا ذکر ہے یہ
آنکھ پر کچھ جھکا کے باندھی تھی
میں نے رشیم کی مشہدی لگی
”یہ میری آنکھ چھپ گئی تھی“

منہ میں قینچی کا ایک لگرٹ تھا
کسی معشوق کو تنہا
کان میں عطر کی پھری تھی
دُور نڈتی ہر نگاہ میری تھی

اس سے اور اسی سے

(۱)

زیریں کے چاند ترا حسن آسمانی ہے

ہر ایک جلوہ ترا اک نہی کہانی ہے

ہے تیرے جلوں کو نشہ میری عمر کی رات

زہے نصیب کہ تو مری شریک جیتا

ہے میرے اچھے ہونے گھر کو انتظار ترا

تو اے بہار اے آگے رشکِ خلد بنا

گھراؤں کا جو ہر شام ہو کے میں بے حال

نہال دل کو کریں گے یہ تیرے پھول گول

گلے میں ہوں گے مے ہا تیری بانہوں کے

چمک اٹھیں گے تنکے تری نکاحوں کے

کرے گی زندہ مجھے تیری دلنشین گفتار

مرے سین میں ہے گا سدا یہ حسن بہار

کھلے گی دل کی کلی روح شاد ماں ہوگی

بہشت ہوگی اسی گھر میں تو جہاں ہوگی

قدم نما و فرود آگے خانہ خانہ قسمت

(۲)

خدا کے واسطے کھولو بھی آگے دروازہ

میں کتنی دیر سے باہر کھڑا ہوں چینج رہا

اگر عییل نہ ہو آپ کا مزاج شریف

تو پیکھا جھلے ذرا اٹھ کے کیجئے تکلیف

یہ چار پانی مری ٹیڑھی کیوں بچھائی ہے؟

بھلا اکتی یہ کیوں فرش پر گرائی ہے؟

الہی کون یہ پانی کا سے گا اتنا بیل؟

خدا کے واسطے کرنل کو بندے کاہل

میاں کے دوست

اُسے میاں کے دوست تو آتے چلے گئے
چھوٹے سے ایک گھر میں سماتے چلے گئے
وہ قہقہے لگے کہ چھتیں گھر کی اڑ گئیں
مبنیاد سارے گھر کی ہلاتے چلے گئے
بکواس اُن کی سُن کے قباطین رو پڑے
رویاجو ایک سب کو رلاتے چلے گئے
نوکر نے آج چائے کے دریا بہا دئے
دیا سمندروں میں سماتے چلے گئے
الٹاریوں میں سم گئے بکٹوں کے بٹن
بچن بچن کے ایک ایک کو کھاتے چلے گئے

چچا تیاں میرے اللہ سب کی سب کچی!
تمام عمر ہی شاید رہو گی تم بچی،
تمک کی کان اُلٹنی ہو آج سالن میں
اٹھا پیالہ پٹخ دے یہ جا کے انگن میں
بس اٹھ بھی اب کوئی ایسا بڑا تو حال نہیں
یہ مجھ غریب کا گھر ہے یہ ہسپتال نہیں
دبا ہے پر میرے اٹھ کے! اٹھ بھی اٹھائے سست!



کھانے کی چیزوں نادر و نایاب ہو گئیں

دلی کا قتل عام چماتے چلے گئے

شیروں کی طرح ٹوٹ پڑے آکے میز پر

جو چیز بھی ملی، وہ چباتے چلے گئے

جیسے پولیس میں پکڑتا ہے چور کو

ہر شے پکڑ کے پیٹ میں لاتے چلے گئے

انجن کی طرح منہ سے اُگلے لے دھڑواں

اُد بگروں کی راگھ گراتے چلے گئے

ہر سمت پھینک پھینکے ماچس کی تیلیاں

کوڑے کا فرش گھر میں بچھاتے چلے گئے

کمرے میں گھومتے ہوئے کیچڑ بھرے وہ بُڑ

تالین کے نصیب جگاتے چلے گئے

دیواروں سے جکے لے لے پھرتے ہوئے دہر

ہر نقش ماسوا کو مٹاتے چلے گئے

آدازیں "آخ تھوخ" کی ہوتی رہیں بلند

سوئے ہوئے گلوں کو جگاتے چلے گئے

کوئی کتاب اپنے ٹھکانے نہ رہ سکی

ہندی کو فارسی میں بلاتے چلے گئے

اخباروں کی وہ دھجیاں بکھریں کہ کیا کہوں

اب ان سے وہ نگاہ کے ماتے چلے گئے

دیواریں وہ نہیں رہیں وہ در نہیں رہا

جس گھر پر مجھ کو ناز تھا وہ گھر نہیں رہا



بیوی کی سہیلیاں

آئی جو ایک اور بھی آتی چلی گئیں
 چھوٹے سے ایک گھر میں سماتی چلی گئیں
 بچوں کی فوج کے ہوئیں گھر پہ حملہ زن
 ہم و دشمنوں کے ہوش اڑاتی چلی گئیں
 غنچہ دہن اگلے رہے دودھ بار بار
 یہ بار بار دودھ پلاتی چلی گئیں
 ننھوں نے ڈرائنگ روم میں دریا بہا دیئے
 دریاؤں میں یہ بند لگاتی چلی گئیں
 بچوں نے چھپڑے ناک سے نغمے سُرد سُرد
 ناکیں کپڑے کے چھوں یہ کراتی چلی گئیں

دیوار پر جہاں بھی سفیدی نظر بڑی
 کتھے کے پھول اُس پہ بناتی چلی گئیں
 اوراق ہر کتاب کے اُلٹے لگا کے تھوک
 پیکیوں کی مہراں پہ لگاتی چلی گئیں
 کھینچے اٹھوں نے اُکے میرے ریڈیو کے کانا
 چاروں طرف سے اُس کو بجاتی چلی گئیں
 کھانے میں نقص اٹھوں نے کاسے ہزا ہزا
 ہر ناپسند چیز کو کھاتی چلی گئیں
 بولی جو ایک "کامیں" تو بولی "کامیں" گائیں
 پھر "کامیں" کامیں "کامیں" سناتی چلی گئیں
 اس گھر میں آ کے کھلنے لگے سب گھروں کے راز
 پر پڑے ہوئے تھے اٹھاتی چلی گئیں
 ہر ایک کا تھا یاد انہیں تجربہ نسب
 ہے کون کس کا باپ؟ بتاتی چلی گئیں

سُسرال کی جیل

(ایک قیدی بہو کی فریاد)

کیا لکھتوں امی آپ کے خط کے جواب میں
کب سے ہوں کیا بتاؤں جہانِ خراب میں
سُسرال والوں نے مجھے ڈالا عذاب میں
یوں دب گئی ہوں جیسے ورق ہو کتاب میں
جہنم کی موج رہ نہیں سکتی چنات میں
میں ہوں "سمندِ تازہ" پر پاپے رکاب میں

کل مجھ سے سچ کہا چچا غالب نے خواب میں
"ہلتی ہے نوٹے ساس سے نارِ اہتاب میں"

لیو سے نہ میرا نام "ستم گز" کے بغیر
سوتی نہیں کہی مجھے "کافر" کے بغیر

ہمسایوں کے سر کی چھامت کے بعد بھی
قبینچی زبان کی یہ چپلاتی چلی گئیں

ہر سال ان کی عمر گھٹی چار پانچ سال

ہر سال "عمرِ غیر" بڑھاتی چلی گئیں

دلہن کی طرح گھر تھا ہمارا سجا ہوا

بیوہ کی طرح اس کو مٹاتی چلی گئیں

درو کے آج مانگے ہا ہوں ہی دعا

اس گھر میں یہ بلائیں پھر آئیں سے خدا



کہتی ہے آگئی مرے گھر پر کئے بغیر
 بستر بچھا دیا مرے در پر کئے بغیر
 آفت یہ آگئی مرے سر پر کئے بغیر
 کیوں روز مجھ سے لیتی ہے ٹکر کئے بغیر
 کیوں ڈالتی ہے چائے میں "شکر" کئے بغیر
 میں تجھ کو کھینچ ماروں گی پتھر کئے بغیر

پتھر جو ماروں میں تو نہ رونا جواب میں
 رہ ایسے جیسے پاؤں لہے ہے جواب میں

ہنستی ہوں جب ذرا "دُرخِ دلدار" دیکھ کر
 روتی ہے میری ہمت دیدار دیکھ کر
 جلتی ہے میری تابشِ رُخسار دیکھ کر
 کڑھتی ہے میری چلبلی رفتار دیکھ کر
 ہنستی ہوں میں یہ ساس کے اطوار دیکھ کر
 جیسے شہید ہنستا ہے تلوار دیکھ کر

یہ ساس ہے کہ شیر چھپا ہے نقاب میں
 اللہ کسی کو ساس نہ دیوے شباب میں

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں
 سوتی ہے وہ سنبھالتی ہوں ساسے گھر کو میں
 بلو کو چپ کر اؤں کہ ماروں سسر کو میں
 فرش زمین دھوؤں کہ مانجوں نگر کو میں
 کیوں اپنا گاؤں چھوڑ کے آئی نگر کو میں
 رورو کے یاد کرتی ہوں قادر مگر کو میں
 دکھتی ہے ساس ہی مجھے دیکھوں جدھر کو میں
 ہر اک سے پوچھتی ہوں کہ دیکھوں کدھر کو میں
 ناز و ادا سے مقام کے اپنی کمر کو میں
 جب اپنے دکھ سناؤں قمر کے پدر کو میں
 کہتے ہیں دیکھ آگ لگا دوں گا گھر کو میں
 سننا نہیں ہوں دکھڑے کسی کے سحر کو میں

گھائل کروں گا دل کو نہ زخمی جبگر کو میں
اے کاش جانتا نہ تیری رہ گزر کو میں

اچھا یہی ہے ڈھونڈ لے راحت عذاب میں
اماں کا ذکر کفر ہے میری جناب میں

دیووں سے بھی ہیں بڑھ کے میری دیو رانیاں
پیپر میں چھاپ دوں گی میں ان کی کہانیاں
”پچھلی طرت کو پاؤں“ ہیں ان کی نشانیاں
چو لھے میں جائیں ان کی یہ خطا لم جوانیاں
کرتی ہیں راج گھر پہ یہ شیطان کی نانیاں
اس گھر میں فٹ ہیں جیسے گھڑی میں کمانیاں
جادو گروں سے سیکھ کے جادو بیانیاں
کرتی ہیں مجھ غریب پہ یہ ظلم رانیاں
کیا بکھتوں اُن کی مجھ پہ ہیں کیا مہربانیاں
ہر بات میں دکھاتی ہیں یہ نکتہ دانیاں

اک دو نہیں ہیں خیر سے چودہ ہیں رانیاں
خام و سحر یہ کرتی ہیں ریشہ دو انیاں

رہتی ہوں رات دن میں اسی بیچ و تاب میں
پہنچا دیں سانس دان انہیں ماہتاب میں

تندوں کی ہر نگاہ جبگر تک اتر گئی
اپنے خسر کی ڈانٹ میں سنتے ہی ڈر گئی
پہلی ہو تو خیر سے اللہ کے گھر گئی
ہنس ہنس کے جینے آئی تھی رورو کے مر گئی
آئے گی تیسری بھی اگر میں گزر گئی
”اب آبروئے خبیوہ اہل نظر گئی“
کہتے ہیں تہ کے تڑکے ہو کیا تو مر گئی؟
اٹھو بس اب کہ لذتِ خواب سحر گئی!

دیور ہیں یا کہ زہر لاکھ گلاب میں
جلیبٹوں کا ذکر بھول گئی انتظار میں

دو ہمایاں

- شکیلیہ:- تمہارے بچے ہماری بتی کی دم پکڑتے ہیں ان کو روکو
- شکیلیہ:- تمہارے مرنے ہماری چھت پر اذان دیتے ہیں ان کو لوگو
- عقیلیہ:- تمہارا بکرا ہمارے آنکھن میں آگھسا تھا ہلا کے ڈاڑھی
- دو ہتھروں سے اُسے بھگایا وہ جا رہا تھا اٹھا کے ساری
- شکیلیہ:- تمہاری بچی ہماری نانی کو "پو پئی" کہہ کے بھاگ جائے
- تمہارا بچہ ہمارے نانا کو "غنڈہ" کہہ کہہ کے منہ چڑائے
- عقیلیہ:- تمہارا گنا گن میں گھس کے ہمارا سب دودھ پی گیا ہے
- جو انی پیٹے کو کیا کہوں میں ابھی ابھی کھا کے گھی گیا ہے
- شکیلیہ:- میں جانتی ہوں کہ میرے کتنے کو اس پہ تو نے بھی کیا مزادی
- زبان سنبھال اپنی دہنہ چھانپ میں تجھ کو دوں گی حرامزادی

- عقیلیہ:- حرامزادی تو وہ تھی جس دا شنتہ نے تجھ کو جسم دیا تھا
- کلال زادی تھی، مال زادی تھی جس نے رشتہ تیرا یا تھا
- شکیلیہ:- تیرا جیس باپ تیری اماں کو ناگ پور سے بھگا کے لایا
- گیا جو پکڑا تو میرا سسرا ہی کلمو بنے کو چھڑا کے لایا
- عقیلیہ:- تمہارا سسرا وہی جو بھیڑیں کسی زمانے میں ہانکتا تھا!
- ہماری اماں کو روز چھپ چھپ کے اپنی کھڑکی سے بھاگتا تھا
- شکیلیہ:- تمہارا شوہر بھی چھپ کے کھڑکی سے روز بندری کو بھاگتا ہے
- وہ روز کھڑکی کے پاس ہی کیوں بیٹھ بیٹھوں میں ٹانگتا ہے؟
- لگنے تھے کل ہی لکھے جو اُس نے وہ عشقیہ خطاں لپے گیا
- دکھاؤں گی سب کو آج یہ خط پڑھے گا ان کو محسوسہ سارا
- عقیلیہ:- اری بہن!..... آپا..... کیا یہ سچ ہے، میری خطاں معاف کر دو
- بہن بہن سے لڑی تو کیا ہے جو دل میں ہے میل صاف کر دو
- میں کتنی باتیں سنا رہی تھی زبان خاموش تھی تمہاری
- قسم خدا کی بتاؤں کیسے، ہو تم مجھے جان و دل سی پیاری

جلال زاوہ

سو جا ہیبت خاں کے پوتے سو جا چیم دھاڑ خاں

ترے رونے سے بہت تنگ آگئی ہے تیری ماں

مت اکر، چکے سے سو جا، کالے کالے میرے لال

نوج ڈالوں گی میں ورنہ تیرے بے بے بال

تو ہے اک ڈاکو کا بیٹا تو نہیں رو میری جان

سو جا ہیبت خاں کے پوتے سو جا چیم دھاڑ خاں

دیکھ تیرے سامنے دس من کا جو صندوق ہے

اُس کے پیچھے کار تو سوں سے بھری بندوق ہے

اس سے آگے کیا کہوں؟ کھلوا نہیں میری زباں

سو جا ہیبت خاں کے پوتے سو جا چیم دھاڑ خاں

تم اپنے گھر میں مجھے بلانا میں چھپ کے دیکھوں کی نظارہ
جو وہ اشائے کریں گے تم کو ہوا کروں گی میں عشق سارا
ابھی میں آتی ہوں میری پیاری رومال میں باندھ کر مٹائی
خدا مجھے بھی وہ خط پڑھانا کہ جن میں اللعت گئی جتائی
تمہارا کتا اور حوجو آئے نہ رو کو معصوم جانو ہے
دباں جو کھائے یہاں بھی کھائے کہ یہ بھی آخر اسی کا گھر ہے
تمہارا بکلا بھی ہنسنا ہے گھر میں آ کے ہلا کے ڈاڑھی
میں پیار سے روک دوں گی اس کو اگر وہ میری اٹھائے ساڑھی



ایک دن کا ذکر ہے روتی تھی میں سوتی نہ تھی

باپ تیرا چپ کراتا تھا میں چپ ہوتی نہ تھی

توڑ ڈالیں اُس نے اک نکتے سے میری پسلیاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا چیمِ دھاڑ خاں

جب گھروں میں کودتا ہے وہ کسی دیوار سے

قفل کھل جاتے ہیں ڈر کر اُس کی اک لٹکار سے

سہم کہ ہر چہ یہ کہتی ہے اجی میں ہوں یہاں!

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا چیمِ دھاڑ خاں

دست بستہ ہو کے موت اُس سے کہے آدابِ عرض

عالی جا با آپ پورے کر رہے ہیں میرے فرض

آپ کو لوگوں بھلا یہ مجھ میں ہمت ہے کہاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا چیمِ دھاڑ خاں

بچ میں سب شیرِ برائے سے کہیں بعد از سلام

حکم دیجئے کس کو پھاڑیں آپ کے ادنیٰ غلام

آپ کے بچے شہنشاہوں کی گردیں بوٹیاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا چیمِ دھاڑ خاں

”پھو“ کرے تو چاند کا دیک بچھا سکتا ہے وہ

”شو“ کرے تو آگ ساگر میں لگا سکتا ہے وہ

اُس کو غصہ آئے تو اُلٹی بہاد سے ندیاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا چیمِ دھاڑ خاں

ہاتھیوں کے شوخ بچے بن میں جب سوتے نہیں

اور ریں ریں کر کے جب روتے ہیں چپ ہوتے نہیں

سُن کے اُس کا نام کر دیتے ہیں بند اپنی نغاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا چیمِ دھاڑ خاں

زیوروں کی بوریاں اونٹوں پر لے کر آئے گا

آج نوٹوں سے لدے چھکڑے وہ گھر میں لائے گا

میں اکیلی جان اتنے نوٹ رکھوں گی کہاں

سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا چیمِ دھاڑ خاں

جمال زادہ

میرے نئے چاند مت رو میرے شاہزادے سو جا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رُلا دے سو جا
تیرا باپ میرے گھر سے مجھے درغلا کے لایا
ہوا وصل درجہنم جو مجھے بھگا کے لایا

تھا جمال نام اُس کا اے جمال زادے سو جا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رُلا دے سو جا
مجھے موہنے کو جس نے کیا روز مجھ سے دنگا
نہیں اب وہ آنے والا گیا جاگ وہ لفتنگا

جسے میں کبھی نہ بھولوں تو اُسے بھلا دے سو جا
تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رُلا دے سو جا

وہ اٹھی آنکھی وہ سہمے گھر کے سب دیوار و در
اڑ گئے شانوں سر کو تے شاید آتا ہے وہ گھر
پونچھ لے جلدی سے اُسو گر ہے پیاری تجھ کو عیاں
سو جا ہیبتِ خاں کے پوتے سو جا جیحم دھاڑ خاں



وہ کواڑ بند کر کے مجھے روز پیٹتا تھا

کبھی مثل چار پائی وہ مجھے گھسیٹتا تھا

تو اگر ہے میرا بیٹا اُسے بددعا دے سو جا

تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سو جا

میری چٹیا اُس نے کاٹی میری ٹانگ اُس نے توڑی

میرا کون ہے جہاں میں کہاں جاؤں میں نگوڑی

جو میں کر چکی ہوں اُس کی نہ مجھے سزا دے سو جا

تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سو جا

وہ جو عاشقی کے دن تھے وہ کبھی کے کٹ چکے ہیں

میرے پک چکے ہیں زبور میرے کپڑے پھٹ چکے ہیں

کہیں میری آہ سوزاں نہ تھے جلا دے سو جا

تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سو جا

نہ لیوں پہ اب ہے سرخی نہ وہ منہ پہ اب ہے غاڑہ

لئے جا رہی ہے قسمت میرے عشق کا جنازہ

کہیں حادثہ یہ پاگل نہ مجھے بتا دے سو جا

تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سو جا

مجھے کون آسرا دے، میں ہوں شہر میں اکیلی

نہ برا عزیز نہ کوئی، نہ مری کوئی سہیلی

میرے غم کو میرے دکھ کو تو ہی آسرا دے، سو جا

تیری ضد کہیں اے ظالم نہ مجھے رلا دے سو جا

ارے سو، نہیں تو دوں گی تیرے منہ پر ایک تھپڑ

کہیں پھینک دوں گی یاہر، تجھے مار کر دو ہتھڑ

اے سُر کے نیچے مت رو، اے سُر ادا دے سو جا

تیری ضد کہیں اے ظالم، نہ مجھے رلا دے سو جا



”ارے پھوڑو کلائی تو بہ چوڑی ٹوٹ جائے گی“

”میرا منہ بیٹھا کرتی جا۔ کلائی چھوٹ جائے گی“

”میں رو دوں گی مجھے پھوڑو، چچی کو جا کے پکڑو“

”چچی چوٹھے میں جائے، پیاری بتو مجھ سے اکر وٹا“

”ارے میں مر گئی تو بہ چچی وہ آگئی پھوڑو“

”گئی ہرنی میاں اب بیٹھ کر تم اپنا دل جوڑو“

”انہیں راہوں میں بیٹھا روز سٹھ گڑ گڑاتا ہوں“

”سوا اس کے قصور کے میں سب کچھ بھول جاتا ہوں“



چاچا رحیم اللہ

”مجھے روکا ہے کیوں؟ کیا بات ہے چاچا رحیم اللہ“

”اری یہ پوچھنا تھا آج کیسا ہے کریم اللہ؟“

”کریم اللہ تو کہتا تھا چچا سے مل کے آیا ہوں“

”اری اب بیٹھ بھی تا، آدھر، کیا میں پرایا ہوں؟“

”چچا جانے دو، زیہ تو تاک میں ہر وقت رہتی ہے“

”بہت آتا ہے غصہ تو چچا کیوں مجھ کو کہتی ہے“

”جو کہتا ہے ذرا جلدی کہو، اب مجھ کو جانا ہے“

”تیرے ہونٹوں پہ ظالم ہر گھڑی کوئی بہانا ہے“

”اوئی اللہ اتر آئے ہو تم تو باہتسا پانی پر“

”او ظالم بیٹھ جا بس دو منٹ اس چار پانی پر“

پانچ چھ تکیوں کو پھیلا کر اڑھا دو، اک لمحات

بھاگ جاؤ۔ بیویاں سمجھیں گی شوہر گھر میں آئے



کوشش کروں ہزارا نہ آئے گی مجھ کو نیند

تکیہ ہے نرم۔ بیوی کا برتاؤ سخت ہے



خدا یا کون تیرے تکیے پہ تیرے بلکہ گیا اگر

تو اس رنج بالیں ہے۔ تیرا تن بار بستر ہے



میرے تکیوں پر لکھے ہوئے اشعار

یہ آرزو ہے کہ سویا رہوں ہزاروں سال

قیامت آئے تو بیگم مجھے جگا دینا



کھا نہ ہمسائی سے میری چنلیاں جان بہار

میں نے آنکھیں بند کر لی ہیں، مگر سویا نہیں



بھیجے پہ شب کو پانی پھڑک کر میں سو گیا

وہ سمجھیں اکن کے بھر میں رو دیا تمام رات

ہمیں ہماری بیویوں سے بچاؤ

پر پل پڑتی ہیں ہم پر، جب بھی ہم دفتر سے آتے ہیں
 ہلاکو خاں سے یا چنگیز خاں سے ان کے ناتے ہیں
 نہ اٹھ کر کھینچا جھلتی ہیں، نہ دیتی ہیں ہمیں پانی
 پسینہ اپنا ہم تو ٹھنڈی آہوں سے سکھاتے ہیں
 انہیں لازم ہے جب ہم آئیں یہ جھک کر قدم چھولیں
 مجازی ہم خدا ہیں پھر بھی ان پر رحم کھاتے ہیں
 اڑا لیتی ہیں سب نقدی تلاشی جیب کی لے کر
 ہم اپنی ہی کمائی ان سے ڈر ڈر کے چھپاتے ہیں
 کچھانگم ٹیکس لے جاتے ہے، کچھ بیوی اڑاتی ہے
 قسم اللہ کی شوہر بہت دولت کھاتے ہیں

سیلی ان کی آجائے تو سمجھو عید ہے ان کی
 بگڑ جاتی ہیں، جب ہم دوستوں کو گھر بلاتے ہیں
 نہیں جاتیں کبھی یا درچی خانے میں یہ بھولے سے
 کھاتا ہے بہت آقا، مزے نوکر اڑاتے ہیں
 بہانہ کر کے دروسہ کا اکثر لیٹ جاتی ہیں
 نہ ہو نوکر اگر گھر میں، تو ہم چائے بنا تے ہیں
 ہے ان کا کام رونا، پان کھانا یا بگڑ جانا
 گریں کیا بادل ناخواستہ ان کو مناتے ہیں
 خدایا آج کے شوہر ہیں یا معصوم بچتے ہیں
 ذرا سا گھور لے بیوی، تو جھٹ یہ سہم جاتے ہیں
 یہ جب ردتی ہیں ہم اپنے کلجے تھام لیتے ہیں
 سیاہی چوس لے کر ان کے آنسو ہم سکھاتے ہیں
 حجامت روز کر دیتی ہیں یہ غصے کی تینھی سے
 عنایت ہے کہ اپنی شیو تو ہم خود بنا تے ہیں

آفاق جب مرغ دیتا ہے سمجھتی ہیں یہ لوری ہے

انہیں مرغے سلاتے ہیں، ہمیں مرغے جگلاتے ہیں
چلے جاتے ہیں کھا کر روکھی سوکھی اپنے دتر کو

بچارے مرد سب رورو کے اپنے دن تیتے ہیں

بمردِ شتر جیسے بھی ہیں شوہر رانجنے جائیں گے

سدا جو بیویوں کے ظلم سہہ کر سکرانے ہیں

کبھی آزاد تھے ہم ہائے اس قیدِ غلامی سے
وہ دن کتنے تھے اچھے ہائے وہ دن یاد آتے ہیں



دشکِ نیم شب

کھٹ کھٹا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

اے مری ٹوکھی ہوئی بیوی قدامت سے بول

رات کو دیر سے آنا میری عادت تھی ہی

میرا ہر شب چھپا تا تیری فطرت ہی تھی

میری راحت کیلئے تھوڑی ہی زحمت تھی ہی

حرفِ اُلفت نہ تھی حرفِ ملامت ہی تھی

شیریں آواز کا کافی میں میرے سب رس گھول

کھٹ کھٹا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

شک نہ کر بھوپہ مری جان سے پیاری ممانہ

پڑھ رہا تھا کسی سجد میں تہجد کی نماز

ایک ہی صفت میں کھڑے تھے وہاں مگر دو ایاز

نہ کوئی بندہ وہاں تھا نہ کوئی بندہ نواز

میرے ہی گھر سے نہ کہہ جائے میرا بستر گول

کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

پھول اک روز تیرے پیار کے توڑے ہیں نے

کھائے والد سے تیرے عشق میں کوڑے ہیں نے

مر مر رہا تیرے پھر بھی نہ چھوڑے ہیں نے

بھر سسرال میں ددڑا دے گھوڑے ہیں نے

اپنے ماضی کی ترازو میں ذرا مجھ کو تول

کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

”عشرت بیوی ہے شوہر میں فنا ہو جانا

نہ کہ ہر بات میں شوہر سے خفا ہو جانا

یک بیک رحم و مروت کا ہوا ہو جانا

بادر آیا ہمیں بیوی کا جسد ہو جانا

پر خدا کو بھی نہیں بندوں پہ اتنتا کٹر تول

کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

تجھ کو میری ہی قسم ختم کر اب تو یہ سوانگ

رات کو کھیل نہ غصے کی یہ پیاد می پنگ پانگ

اُدچی دیوار سے کودا تو سرک جلے گی ٹانگ

مجھ سے پہلی سی محبت میری ممتاز نہ مانگ

اور بھی سنکر ہیں بیوی کی محبت کے ہوا

راحتیں اور بھی ہیں بیوی کی راحت کے ہوا

کیسے کر سکتا ہوں دن رات میں مجھوں کا دل

کھٹ کھٹاتا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

”آہ کہ چاہیے اک عسرا تہ ہونے تک“

کھٹ کھٹاتا ہی رہوں گا میں مگر ہونے تک

”دیکھیں کیا گزرتے ہے قطرے پہ گھر ہونے تک“

میں بھی جیتا ہوں محلے کو خبر ہو سننے تک

آج آتر جائے گا شاید میری عزت کا خول

کھٹے کھٹانا ہوں بہت دیر سے دروازہ کھول

اچھا جاتا ہوں مجھے دل سے محبت دینا تم

یاد بھی آؤں تو دو اشک بہا لیتا تم

میری تصویر کو سینے سے لگا لیتا تم

ختمِ راسخ ہو تو بنیے سے مرگا لیتا تم

کچھ تاہم ہوں کہ کیوں تم سے پڑھ لے دو لول

اب نہیں تم سے کہوں گا کبھی "دروازہ کھول"



مثنوی قمری عشق

(۱)

ایک لڑکا "لڑکیاں" اپنی سدا
ایک دن سوچی شرارت یہا سے
چٹھ کے اک ٹیلے پہ چلانے لگا
گاؤں والے سن کے یہ گھبرا گئے
تسبے شادی اسکی کر دی ایک سے
شہر میں ساتھ اپنے اس گئے گیا
وہ تھی موجِ حسن یہ موجِ شباب
مسکتے وہ سب دلہن کی چاہ میں
رات دن ڈولہانے دی جب اور عشق
گاؤں کے باہر "سچایا" کرتا تھا
ایک لڑکی سے محبت وہ کرے
"عشق آیا عشق آیا دوڑنا"
اُس بچارے کی مدد کو آگے
بل گیا وہ ان میں سب سے نیک سے
گاؤں کو داغِ جدائی دے گیا
چینی کی گڑبیا دیا اس کو خطاب
سب کے سب آنکھیں بھاتے راہ میں
ایک لڑکا پیدا ہوئی اولادِ عشق

عظمت اللہ خاں رکھانچے کا نام

ماں کی گودی میں تھا بچہ شاد کام

(۲)

وہ تھا دولہا اور دلہن تھی یہ کینز
بتلی تلی شورخ کو مل اور دینز

کچھ زمانہ خوب خوشیوں میں کٹا
ٹانگ ہی ٹوٹی نہ میرا سر پھٹا

آخر غم بندی سے وہ اگتا گئے
میرے گردش میں تارے آگئے

روز مجھ پر سختیاں ہونے لگیں
مڑگیں آنکھیں میری ہونے لگیں

چینی کی گڑیا وہ ڈان بن گئی
ام کی ڈانی بکان بن گئی

آج ہنگامہ سا گھر میں ہو گیا
جاگ کر میرا نصیب سو گیا

رکھ کے سب شرم و حیا بالائے طاق

آج اس بندی نے لے لی ہے طلاق

(۳)

صبح یہ کتنی عظیم الشان تھی
چھ تھے وہ اور میں اکیلی جان تھی

ترکے ترکے جب چھڑا گھر میں فساد
میں بھی بولی دل میں ہر چہ بادہ باد

میری نندوں نے مجھے رندی کہا

دیوروں نے مجھ کو بگڑندی کہا

جلد سے جب بولے کہ تو کتے کی دم

میں بچا کر ہاتھ بولی ہو گئے نم

ساس کے زیرِ نغداں تھی چھری

زرگس آسا تھی وہ آنگن میں کھری

گھوڑ کر اس نے کہا بچہ سکے ہائیں

بھیر جا، یعنی ہوں میں تیری بلدیں

پہلے آپٹی وہ آتش کی طرح

بعد میں برسی وہ بارش کی طرح

گالیوں کی ہر طرت بوجھا، تھی

اک ذرا گھونگھٹ کی تھوڑی آڑ تھی

دستِ شفقت مجھ پر جب پھرنے لگے

ٹپ ٹپ آنسو آنکھ سے گرنے لگے

جب میرے دے کے لٹے تھک گئی

کو لے لٹکاتی وہ بلیٹھا تک گئی

ہانپ کر بولی کہ بیٹا امدد!

لے کے ڈنڈا آگئے عبدالصمد!

مجھ پر وہ ڈنڈا پھرا پھر اس طرح

کاغذی لکڑی پہ رندا جس طرح

میری چیموں کی جبین شہنائیاں

کھڑکیوں میں آگئیں ہسائیاں

سب مجاہدین میں کچھ ایسے ڈٹے

چوڑیاں ٹوٹیں مرے کپڑے پھٹے

تھام کر بازو گماتے وہ رہے

جسم کی پھر کی پھرتے وہ رہے

میں نگوری ہوگی جیسا دھوئی
 فرش پر خوش کھاکے اک دم گر پڑی
 ہو گئے "وہ" چار پائی پر دراز
 گاڑ دی بندی پر چشم نیم باز
 منہ میں اپنے ٹٹوں کو رکھنے کی نئے
 کش لگائے چند آنکھوں نے پے پے
 لے چھو سے اور یہی کچھ بھیجے؟
 میں یہ بولی "ہاں وہ پرزہ" دیکھئے

بھٹ آنکھوں نے ہاتھ میں دیدی طلاق

"عظمت اللہ؟" بولے "ہاں ہاں وہ بھی عاق"

(۵)

عارضوں پہ تھپڑوں کی لایاں
 مہر میں لاکھوں ملی ہیں گایاں
 گھر سے دراز سے پہ بندی ہو کھڑی
 اور کئی چٹیا ہے آنکھوں میں پڑی
 ٹھنڈا پانی پی کے کچھ تھرماس کا
 آخری پوسہ یا ہے ساس کا
 ڈانگہ یا ٹم ٹم ابھی منگواؤں گی
 خیر سے بیکے چلی اب جاؤں گی

ساتھ میرے عظمت اللہ خان ہے

لب پہ گل من علیہا فان ہے



ڈرامہ شیریں سراو

فراد :- مرے دل کی دھڑکن مری شاہزادی

مری آنسوؤں نے تجھ کو صدادی

باس حسین تیرا یوں جگ گائے

چمک دیکھ اس کی قسم سہم جائے

گستاخوں میں بلبل تیرے گیت گائے

گلی تیرے لب کا تبسم چرا لے

ترے عشق نے آگ مجھ کو لگا دی

مری آنسوؤں نے تجھ کو صدادی

شیریں :- یہ جی چاہتا ہے کہ اب مسکرا کے

سرخ دلوں یہ میرے یہ موتی اٹھاکے

پھر ہم نے لیں آنکھیں کھول

مانگے کی کتابیں — واپسی پر

”کلام حالی“ پہ گھی کی تھالی رکھی رہی تھی، معاف کیجئے
 پھر اس پہ اک دن دوات پیری اُلٹ گئی تھی، معاف کیجئے
 ”کلام داغ“ آہ کتنے چونے کے پیاسے داغوں کو بھر گیا ہے
 ادب اس میں سے اک حسین غزل میں نے پھاڑ لی تھی، معاف کیجئے
 ”کلام غالب“ پہ غالب آئی تھی میرے بچوں کی برتیزی
 ورق ورق ہو کے ہر غزل ان میں بٹ گئی تھی، معاف کیجئے
 ”کلام آزاد“ جلد سے اپنی آج آزاد ہو گیا ہے
 کہ اس پہ ننروں میں چھینا بھٹیسی ہو گئی تھی، معاف کیجئے
 ”کلام آتش“ باورچی خانے میں لے گئی تھی میری پڑوسن
 سرورق پر حساب بننے کا لکھ گئی تھی، معاف کیجئے

”فسانہ میز پر ذرا کھیر گئی تھی، نہ آہیں بھریئے
 وہ کھیر جھٹ میں نے اپنے دامن سے پونچھ دی تھی، معاف کیجئے
 ”انیس کے مٹوں“ پہ آنسو میرے گرے تو ورق پیسے
 رکا کے آنکھوں سے ان کو شاید میں دم پڑی تھی، معاف کیجئے
 وہ ڈال جبریل“ کھو گئی لے گئے ہیں شاید اُسے فرشتے
 سنبھال کر ورنہ طاق نسیاں میں یہ رکھی تھی، معاف کیجئے
 ”کلام اکبر کو میرے اصغر نے چار آنے میں بیچ ڈالا
 زیادہ پیسے نہیں ملے چونکہ پھٹ گئی تھی، معاف کیجئے
 ”وہ شعلہ و شبنم“ ایک مزدور مجھ سے یہ کہہ کے لے گیا تھا
 کہ جوش نے یہ کتاب میرے لئے لکھی تھی، معاف کیجئے
 ”بہارِ اختر“ کو میرا اختر نہ پھینک آیا ہو وادیوں میں
 کتاب یہ اُس نے منقح سلمی سے چھین لی تھی، معاف کیجئے
 وہ ”نقش فریادی“ رُو اس چل دی کہ رُو اس اُس کو پسند آیا
 ہمارے گھر میں بہت ترقی نہ کر سکی تھی، معاف کیجئے

دو حرام زانے

- پہلا شرابی :- زمانہ گردش میں جھومتا ہے نشے نگاہوں کو آسے ہیں
وہ ہاتھ زندہ رہیں خدایا جو مجھ کو دوسرے مسکلی بلا ہے ہیں
- دوسرا شرابی :- جناب کیا آپ ہوش میں ہیں ؟ اگر ہے ایسا تو اور لیجئے
شراب خانے میں آئے ہیں تو خودی کو غرق شراب کیجئے
- پہلا شرابی :- نشہ بہت ہو گیا ہے صاحب نہ اور دیکھئے شراب مجھ کو
کہ ایک بڑا سانپ لگ رہا ہے یہ لمبا لمبا کیا مجھ کو
- دوسرا شرابی :- کباب تو بہترین ملتے ہیں شام کو میرے گھر کے آگے
اور اتنے خستہ کہ ٹوٹ جائیں اگر نہ پیٹے ہوں ان پہ دھاگے
- پہلا شرابی :- پتہ جناب اپنے گھر کا اس خاکسار کو بھی بتائیے گا
یہ کارڈ میرا ہے بھائی صاحب ! ضرور تشریف لائیے گا

۱ کتابِ راشدہ تو تاقیوں کی تلاش میں آج گھر سے چل دی
میں کیا کہوں یہ بہت ہی آزاد ہو گئی تھی، معاف کیجئے

۲ کلامِ چرکین پہ ایک دھبہ نہیں لگایا ہے دیکھ لیجئے
کتاب یہ آج ہم نے کر کے وضو پڑھی تھی، معاف کیجئے

بہت حفاظت سے لائی ہوں یہ کتابیں اپنی سنبھال لیجئے
میں پڑھ چکی "تظم" نثر الماریوں سے مجھ کو نکال دیجئے



پہلا شرابی:- اٹھو نمبر، نظام منزل، یہ میرے گھر کا پتہ ہے صاحب!
 دوسرا شرابی:- مگادوں ٹیکسی؟ بہت نشہ آپ کو اگر ہو گیا ہے صاحب!
 پہلا شرابی:- نشے میں کوئی بھی اپنے گھر کا پتہ نہیں بھولتا ہے مسٹر
 دوسرا شرابی:- بہت سی پی لے تو ماں ہیں تاکہ بے یقین بھولتا ہے مسٹر
 پہلا شرابی:- میرے کرتم بے یقین کہو۔ بہک گئے ہونشے میں گم ہو
 دوسرا شرابی:- تو گویا طلعت کے نام پر جو مکاں ہے اُسکے یقین تم ہو
 پہلا شرابی:- قسم خدا کی اٹھارہ نمبر، نظام منزل، میرا مکاں ہے
 دوسرا شرابی:- کرا یہ دیتی ہے اس کا طلعت تو کہہ رہا ہے تیرا مکاں ہے
 پہلا شرابی:- نشے میں کہتا ہوں صحت تجھ سے بہت طلعت کو پار مجھ کو
 دوسرا شرابی:- زبان کو دے لگام ورنہ تو آج کھائے گا مار مجھ سے
 پہلا شرابی:- جو ہاتھ مجھ پر کبھی اٹھایا اطلاق لے لے گی تجھ سے طلعت
 دوسرا شرابی:- وہ تجھ کو سینڈل سے پیٹ دے گی کہ عشق کرتی ہے تجھ سے
 پہلا شرابی:- اگر تجھی سے وہ عشق کرتی، گلے لگاتی نہ وہ مجھے بھی
 دوسرا شرابی:- ابھی جہنم میں جیتتا ہوں تیرے نشے کو بھی ادر تجھے بھی

پہلا شرابی:- گلا پر دست اہٹا لے اپنے، یہ ہاتھ گڈے، یہ کالے کالے
 دوسرا شرابی:- تباہ کر دوں گا۔ مار ڈالوں گا۔ میں نہ پھوڑوں گا تجھ کو سارے
 پہلا شرابی:- اٹھارہ نمبر، نظام منزل میں بول بیٹا کبھی گھسے گا؟
 دوسرا شرابی:- تمہاری ماں کو گلے لگانے تمہارا یہ باپ ابھی گھسے گا
 پہلا شرابی:- مکینے کتے دپھسے گریباں، رذیل پاچی دپھٹی وہ ڈانی
 دوسرا شرابی:- سٹور کے بچے دگلاس ٹوٹے، حرام زادے، ادر گری تپانی
 شراب پھیرا، کھٹاک گھونٹے دھرم بھرم دھاپ چل رہے ہیں
 گلے پھلا کے ڈیس اٹھا کے یہ دونوں مرنے اچھل رہے ہیں
 تیسرا شرابی:- حسین ہے موسم، سماں ہے رنگیں، اڈو نہیں بھائی باز اڈ
 ارے او بیڑا یہ کیا ہے گڈ بڑا؟ یہ مرنے جائیں انہیں چھڑاڈ
 جناب یہ دونوں باپ بیٹے ہیں، بھولی جاتے ہیں دڑپی کے
 یہ دونوں رہتے ہیں ایک ہی گھر میں غل مچاتے ہیں دڑپی کے
 تیسرا شرابی:- اچی وہ طلعت کا کیا ہے قصہ؟ جو بوی زیب داستان ہے
 بیڑا:- اچی وہ ہے ایک نیک عورت جو اس کی بیوی اور اس کی ماں



اُردو ناول میں کیا جھکاؤ ہے؟

کیوں تھی شاعری میں تاؤ ہے؟

شاعری کے ہیں کتنے امکانات؟

اس پر قلبوں کے کیا ہیں احسانات؟

ذوق کتنے روپے کماتا تھا؟

اپنی بیوی سے کیوں چھپاتا تھا؟

مرزا غالب کے کتنے بچے تھے؟

کتنے جھوٹے تھے؟ کتنے سچے تھے؟

آ کے محمود سترہ حملوں میں؟

کون شے لے گیا تھا گلوں میں؟

کچھ کہو آلودوں کے بارے میں

کچھ کہو بجالوؤں کے بارے میں

کیوں ہمیں دیکھ کر ہو تم گم سم؟

آ توؤں سے کبھی ملے ہو تم؟



پورڈ آف انٹرویو

گتا کیوں اپنی دم دیا ہے؟

کتنے میں ایک بندر آتا ہے؟

آسماں پر ستارے کتنے ہیں؟

شہر میں غم کے مارے کتنے ہیں؟

تھوڑی پور میں کتنے مالی ہیں؟

شہر میں کئے مکان خالی ہیں؟

آج کیا بھاؤ ہے تماشے کا؟

کیٹس کا وزن کتنے ماشے تھا؟

لانگت فیلو کی کتنی ٹانگیں تھیں؟

صبحِ رُخنے نے کتنی بانگیں دیں؟

تلاش پیر میں نکلے تھے ہم

بہت طہر بہت بے دین تھے ہم

بہت سے راستے تم نے دکھائے

بہت پتھر تھے رستے سے ہٹائے

یہاں اب ایک بڑی مسجد بنانا

نمازیں رات دن ہم کو پڑھانا

نہ جانا بھاگ ہم سے تنگ آ کے

تمہیں پالیں گے ہم دینے کھلا کے

پلائیں گے تمہیں صبح بادل

کھلائیں گے تمہیں آٹھ ٹہر شام

تمہیں ہم دیں گے بے بے چاقو

پلائیں گے تمہیں کر دو اتنا کور

پورس کے دم تمہیں لگوائیں گے ہم

کبھی تم سے تمہیں لگائیں گے ہم

مریدان باصفا

(۱)

یہاں سے پیر صاحب اب نہ جانا

خدا را یہ رستم ہم پر نہ ڈھانا

مسلمان تم ہو ہم بے دین کافر

تمہیں اول ہمارے تم ہی آخر

بہت ہی دور ہیں اسلام سے ہم

نہیں مانوس ابھی اس نام سے ہم

سمجھ لو کافروں کی تو یہ بستی

یہاں تم سی نہیں ہے کوئی بستی

ابھی تم کو کفن پہنائیں گے ہم
بہت روئیں گے جب دفنائیں گے ہم

دلوں میں ہنوک لب پہ آہ ہوگی
تمہاری اک حسین درگاہ ہوگی

سراہنے اک دیا جلتا رہے گا
درود اور فاتحہ جلتا رہے گا

کہیں گے ہم تمہارا عرس ہر سال
مُریدوں کو وہاں پر آئے گا حال

سب آئیں گے تمہاری لے کے یادیں
بلیں گی تم سے ہم سب کو مرادیں

یہ چہرہ اور یہ ریش پُر انوار
دکھائی دے رہے ہیں آخری بار

چلو اب پیر کو گودی میں لے لو
لحد کی گودی میں اس کو دھکیلو

تہیں اب بیوی بچوں کو کہو یاد
سبھی فکروں سے اب ہو جاؤ آزاد

کہو تو آج بیٹرا پار کر دیں
تمہاری شادیاں ہم چار کر دیں

بہت ہو تم اگر بچوں کے شیدا
یہاں بھی تو وہ ہو سکتے ہیں پیدا

(۲)

بہت عرصے تم گھبراہٹے تھے
وطن کو چھوڑی چوری جا رہے تھے

پکڑ کر مار ڈالا آج ہم نے
شہادت کا پہنایا تلج ہم نے

کہنے ہم نے تمہارے پانچ ٹکڑے
تمہارے کردے سب دُور دکھڑے

سُوروں کی بغاوت

(۱)

جاؤ یہ اعلان کر دو آج باجے بسینڈ سے
اپنے بستروں ہم کہیں گے کل انگلینڈ سے
بچہ بچہ بوڑھا بوڑھا دشمن جاں ہے یہاں
ہم وہاں آباد ہیں ہر سمت ہیں ٹوڑی جہاں
پالتے ہیں موٹا کرتے ہیں۔ بہت کرتے ہیں پیار
پھیرتے ہیں دستِ شفقت ہم پہ آکر بار بار
بوسے لیتے ہیں۔ ہمیں صابن سے نہلاتے ہیں یہ
بعد میں اک دن پکا کر ہم کو کھا جاتے ہیں یہ

کسی کا خاک میں ملنا جوانی دیکھتے جاؤ
بہا کے اشک بس کی لاش فانی دیکھتے جاؤ
بہت یہ وعظ کرتا تھا گر یہ اب نہ پورے گا
کفن سرکاؤ اس کا بے زبانی دیکھتے جاؤ

ماں سوئے غم ہائے نہانی گرنہ دیکھا ہو
ماں سوئے غم ہائے نہانی دیکھتے جاؤ



ہم نے صدیوں ہی سہی ہیں سختیاں انگریز کی

نکڑے نکڑے ہو کے ہم زمینت بنے ہریز کی

کانٹوں اور پھریوں سے ہم کو منہ میں جلتے ہے

ہم کو کھا کھا کر یہ اپنا راج پھیلاتے رہے

کریم بن کر ان کی ہر عورت کے گالوں میں ہیں ہم

بُرش بن کر بن کر پھرے ہر مرد کے بالوں میں ہم

اپنی دم کے بال لے کر شیو یہ کرتے رہے

اپنی دم تک سے بھی بس بی ہیویہ کرتے ہے

بُرش دانتوں کا بنا کر منہ میں لے جلتے ہیں یہ

آدھ جانے اب کہاں تک ہم کو پہنچاتے ہیں یہ

اس قدر ان کی طبیعت ہم پہ مائل ہو گئی

اپنی چربی ان کی چربی تک میں شامل ہو گئی

چھپکے ہر اک چیز میں چپکے سے گھس جاتے ہیں ہم

ان کے ہر شے میں ہر ماہ میں نظر آتے ہیں ہم

اک طرف دشمن خدا ہے اک طرف انگریز ہے

ہم سے دونوں کا رویہ اشتعال انگیز ہے

ایک پل مت سوئیو اب ایک پل مت لیٹیو

باتدھ لو رخت سفر سے ماؤ، بہنو، بیٹیو!

آؤ ہم اس دلیس کو چل دیں مسلمان ہوں جہاں

آؤ اب اس قوم کے جا کر بنیں ہم مہیاں

رہیے داں جا کر جہاں میلوں تک عیسائی نہ ہو

جان دینے کی مصیبت قوم پر آئی نہ ہو،

(۲)

دو برس سے جنگوں میں پھر رہے ہیں ہم اُداس

کیا کریں کوئی پھٹکتا تک نہیں ہے اپنے پاس

دور سے آتی ہے کانوں میں صدائے "آخ تھو"

خوب روتے ہیں کلیجہ بھگام کر "میں اور تو"

ملک اپنا پھوڑنے کا آج یہ ریزلٹ ہے

ہر طرف ذلت ہے اپنی ہر طرف انسلٹ ہے

اس قدر تو ہیں اپنی قوم کی ہوگی کہاں

ہم یہ سنتے ہیں "سور کا بچہ" گالی ہے یہاں

وہ جو میخانوں میں چھپ چھپ کر چڑھتے ہیں شراب

مے تو پی لیتے ہیں وہ کھاتے نہیں اپنے کیا ب

ہم غریبوں کو بھی وہ تھوڑا سا چکھ کر دیکھتے

ایک ٹکڑہ ایم کامنہ میں تو رکھ کر دیکھتے،

گر شرابی لوگ کھا لیتے کبھی اپنے کیا ب

ہے یقین ہم کو وہ نالی میں بہا دیتے شراب

اے خدا آخر بتا کس کام کے ہیں ہم غریب؟

سامنے ہیں ہم مگر کھاتے نہیں یہ بدنصیب

رحم کھاؤ ہم پہ بابا - ہم نہیں اتنے بُرے

یہ ہر تسلیم خم ہے آؤ لے لے کر پھرے

یہ نہیں آئیں گے - کہہ دو آج باجے بینڈ سے

"ہم بہت پھتار ہے ہیں آئے کیوں انگلینڈ سے"

اس سے تو اچھلے ہے - ہم سب ہوت عزت کی مریں

پھوڑ دیں یہ ملک اور انگلیسٹ ہم واپس چلیں

ایک پل مت سوئیو، اب ایک پل مت لپیٹو

باندھ لو رختِ سفر اے ماؤ، بہنو، بیٹیو!

جب وہاں جائیں گے ہم کو بار پہنائیں گے وہ

کاٹ ہی دیں گے تو ہم کو بیار سے کھائیں گے وہ

رہنے کیوں اُس جاہاں بیلوں تک علیساٹی نہ ہو

بن کے دلہن گھر میں کوئی ہم تک آئی نہ ہو!



کردن ان نظاروں کو اب میں بیاں

جو اُس دور میں میں نے دیکھے وہاں

(۲)

خوشی ہی خوشی ہے جاہر دیکھئے

ذرا مسکرا کر ادھر دیکھئے

وہ سڑکوں پہ پنجابی منڈے چلے

کسی نے کہا دیکھو غنڈے چلے

جھکی ایسی پگڑی ہے اک آنکھ پر

پڑے گر کسی پر تو ترچھی نظر

یہ تہ بند پر بوسکی کی تہیض

جو دیکھے تو غش کھائے دل کامیض

یہ دیں اس طرح اپنی مونچھوں پہ تاؤ

کہ رستم بھی اُجھے تو بولیں کہ "اُدا"

مثنوی تاج دین معراج دین

(۱)

میں لکھنے سے پہلے یہ کرتا ہوں طے

یہ انیس سو تیس کا ذکر ہے

یہاں سے میں ہینچا ہوں لاہور میں

سمجھ لیجے انگریز کے دور میں

میں ہوں اور پنجاب کے زندہ دل

وہ رشتہ چہرے وہ تابندہ دل

وہ گھر سے نکل آیا بازار میں

سمجھ لیجے کوٹ اور شلوار میں

یہ منٹوں میں بس دُھن کے رکھ دیں اُسے
 ہزاروں میں یہ سچن کے رکھ دیں اُسے
 یہ سمجھو نہیں پھر بچارے کی خیر
 قیامت تک اُس کو رکھیں گے بے
 ہیں مشوران کے لب "خوش کلام"
 کہیں لوگ ڈر ڈر کے جان کو سلام
 ادب سے کہے جو انہیں "پنلووان" اُ
 رہے عزت اُس کی بچے اُسکی جان
 یہ بھر پور سینہ یہ اٹھتا شباب
 کہیں کھائینگے جا کے نان اور کباب
 "کہا اگر کسی نے کہ کچھ کھا پیئے
 کہا خیر بہتر ہے منگو ایئے"
 نہیں چومتے ان کے لب جام کو
 کہ پیتے ہیں فالودہ یہ شام کو

اکڑ کر چلے کیوں نہ ہر نوجواں
 ہے قینچی کا سگرٹ بنوکِ زباں
 بڑے فخر سے کش لگاتے چلے
 دُھوئیں پر دُھواں یہ اُڑاتے چلے
 اذاکہ رہی ہے کہ ہم شیر ہیں
 ہراک سامنے اپنے بکری کی میں
 طبیعت کے فطرت کے رنگین ہیں
 یہ "کاجو" چلانے کے شوقین ہیں
 نہیں کوئی غم خوش رہیں یہ مدام
 فساد اور دنگے کریں صبح و شام
 جسے چاہیں رستے میں کندھا دکھائیں
 وہ "چوں" بھی کرے تو ابھڑا س سے چائیں
 کہیں کیوں بے گالی کسے تُو نے دی؟
 نکالوں ابھی تیری "فوں" اور "تی"؟

کھدے بازوؤں پر ہیں یاروں کے نام
ہراک ان میں ہے عاشقی کا نام

بہت اونچا عورت کا سمجھیں مقام
یہ کرتے ہیں اس صنف کا احترام

یہ ہیں تلج و معراج و تہتاب علی

اکھاڑوں میں ان کی جوانی ملی
پیار ان کے جسموں نے سرسوں کا تیل

پڑھی ان کے قد پر جوانی کی بیل
بنے جسم فولاد ڈنڈے پھیل کر

گزاریں یہ ہر شام ہنس کھیل کر
نہ دل ہیں یہ لائیں غم خوب زشت

یہ دنیا ہی ان کے لئے ہے بہشت

بظاہر تو برطانیہ کا ہے راج

مگر اصل میں ان کے سر پر ہے تاج



اشتان

پہیل کے اک پیڑ کے نیچے

منگتا ٹیلے کیڑے رکھ کے

اپنی ناک چھنکتا آیا

اور پھر گنگا جہل میں نہایا

گندے منہ سے اگل کے منتر

کرنے لگا وہ جسم پوتر

پاپ اپنے جب دھو گیا منگتا

بھر کر آہ یہ بولی گنگا

یہ کیا کر دیا تو نے آکر۔؟

اب میں کہاں بناؤں جا کر؟

آسماں کا بلبلہ

اس پر بہت ہنستا ہوں میں
میرے خدا سُن تو ذرا
یہ آسماں کا بلبلہ
کیوں تو نے ہم پر رکھ دیا؟



گلاہ پوش

دیران تھا صحرا خاموش تھا دریا
دیرا کے کنارے سردی سے ٹھٹھرتا
اک اوڑھ کے ٹوپی چپ چاپ تھا بیٹھا
گرمی کی لئے ٹیک
کالا سا پہاڑ ایک

بہت بڑا آنسو

کس کی آنکھوں سے گرا ہے؟
یہ سمندر! — یہ بڑا سا آنسو

ایک پہل

(۱)

جیسا اب اٹھو نہ آنسو بہاؤ نہیں وقت رونے کا دریاں بچاؤ
 یہ دُتیا ہے فانی، گیا جانے والا وہ رونے سے واپس نہیں آنے والا
 نہ بیکار اب تم دھانی مچاؤ اٹھو سگے گھر میں صفائی کراؤ
 گو کہ صاف کروں کے جاے ذکیۃ تو پخت سے بڑا بانس اٹھا لار ضیۃ
 چھپا کر کہیں رکھوے میلی رضائی بنائے گی باتیں شفاعت کی تائی
 کہیں صاف بل جل کے آنکھن کو آؤ خدا کے لئے تاک گھر کی بچاؤ
 ذکیۃ کی ماں تیج پستہ منگانا کریم دین کو سے کے سائیکل بھگانا
 مچائی ہے باورچیوں نے دُباٹی نہیں گوشت لایا مجیدہ و قصائی
 ورق یہ ہیں نقلی یہ چاول ہیں گھٹیا انہیں جلد واپس کر اُلو کی نچٹیا

۱۶۰

معزز معزز جو آئیں گے مہاں بہت تاک آدھ بھوں چڑھائیں گے اماں
 خدا کے لئے جسدِ حقیقے منگاؤ میاں بھاگ کر چائے پیٹن کی لاؤ
 جو مرد آ کے اظہارِ ماتم کریں گے وہ بیٹھک میں دُتیں گے چائے پیٹیں گے
 وہ حقیقے ابھی گڑ گڑائیں گے آکر وہ آہیں فلک پر اُڑائیں گے آکر

ستا نہیں گے "مرحوم" کے وہ فرمانے
 کہ لب بولنے کو دیتے ہیں خدا نے

(۲)

دُسن نے اتار نہ تھا سُرخ جوڑا کہ دُولہا نے دُتیاے فانی کو چھوڑا
 بہت خوبصورت بہت نیاک بھناؤ ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا دُہ
 "نماز اک بھی ہرگز نہ اُس نے قضا کی شب روز کرتا عبادت خدا کی
 جدھر دیکھتے ہیں ادھر غم ہی غم ہے کریں اس کا جتنا بھی ماتم وہ کم ہے"

۱۶۱

دیکھ کر پیار سے مجھ کو کہتا تھا خالا
بہت تھا وہ سیدھا بہت بھولا بھالا
جدائی میں اس کی ہوا دل دیوانا
کہ لگتا ہے اچھا نہ پینا نہ کھانا

ہمارے محلے میں وہ جب بھی آتا
خدا کی قسم ہم سے وہ بل کے جاتا
جگر کا وہ ٹکڑا تھا آنکھوں کا تارا
ابھی اپنی اولاد سے بھی تھا پیارا

”نہ رورو کے بے حال ہوائے دلہن تو
نہ کر اس قدر آہ رنج و محن تو
وہ جنت میں خوشیاں منا بیگامت تو
وہ حوروں سے بدل لگا بیگامت تو“

”جیلہ خدا کی قسم مگر اوسے
تیری بے قراری نہ ہم کو رلا دے
وہ آخر ہمیں بھی تو تھا جاں سے پیارا
مگر دے لیا ہم نے دل کو سہارا“

”نہ کر میں اتنے نہ رونا پیاری

ہمارے کلیجے پہ چسپنتی ہے آری

(۳)

رضیہ ذرا گرم چاول تو لانا
ذکیہ ذرا ٹھنڈا پانی پلانا
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ

”جمیلہ مجھے روغنی نان دینا
وہ فرنی اکٹھا نا وہ پکوان دینا
جدائی میں اس کی ہوا دل دیوانا
کہ لگتا ہے اچھا نہ پینا نہ کھانا“

”منگاتا پلاؤ ذرا اور خالہ
بڑھانا ذرا قورمے کا پیالہ
چدھر دیکھتے ہیں ادھر غم ہی غم ہے
کہیں اس کا جتنا بھی ماتم وہ کم ہے“

یہ ننھی کے زردے میں کشمش ہے تھوڑی
بہت دیر سے مانگتی ہے نگوڑی
وہ ٹکڑا جگر کا تھا آنکھوں کا تارا
ابھی اپنی اولاد سے بھی تھا پیارا

”پڑا ہے پلاؤ میں گھی ڈال دے کا
خدا تو ہی حافظ ہے میرے گلے کا
دلہن سے کہو آہ اتنی نہ رورے
بیچاری نہ بیکار میں جان کھوئے“

”اری بوٹیاں تین سالن میں تیرے
یہ چھپڑا لکھا تھا مقدر میں میرے
بہت خوبصورت بہت نیک تھا وہ
ہزاروں جوانوں میں بس ایک تھا وہ“

”وہن گھر میں چورن اگر ہے تو لانا
نہیں تو ذرا کھاری بوتل منگانا
بہت ہی مزیدار تھا تیرا کھانا
بڑھا کر ذرا ہاتھ مجھ کو اٹھانا“

”نہ کہہ میں اتنے نہ رواتا پیاری
ہمارے کلبچے پہ چلتی ہے آری“



پارلسین

”ہنا سنگھ گلہ پڑھا“

”لاالہ“... آگے بڑھا“

”آگے آپ بتا دیجئے

میری جان بچا لیجئے“

”آگے مجھے اگر آتا

تم سے میں کیوں پڑھواتا

سوچ نہ اب بیکار رحیم

مار اس کو تلوار رحیم

دوہ جوں اس کے سب کھڑے

کھڑے اس کے دو کھڑے

بہشت میں بے چین رہتے تھے ورنہ میں آرام کیا

رکھ لیجے آنکوش میں میرا نذرانہ

جنت کا دروازہ کھولئے مولانا

توبہ کتنی دیر لگائی!

ہاں ہاں میں شیطان ہوں بھائی!

آپ کی شمع رُخ کا پرانا پروانہ!

جنت کا دروازہ کھولئے مولانا

چل دوں گا میں پیرِ دبا کے

آپ کو بیٹھی نیند سلا کے

چھلک نہ جائے میرے صبر کا پیمانہ

جنت کا دروازہ کھولئے مولانا



پیر اور مرید

(۱)

کھٹ کھٹ کھٹ!

در پہ کھڑا ہے کیسے، آپ کا دلیرانا

جنت کا دروازہ، کھولئے مولانا

چاند ہے، آدھی رات میں ہے

دیکھنے والا کوئی نہیں ہے

لایا ہے اک "چینہ" مرید مستانا

جنت کا دروازہ کھولئے مولانا

شیطان کے داؤ چلا کے

لایا ہوں اک حور بھگا کے

تکلف کو اب بر طروت کیجئے
نہ اب مجھ سے کہیے خدا کے لئے

”اجی پہلے آپ!“

عنایت ہے شفقت ہے یہ آپ کی!
مگر مجھ سے یہ تو نہ ہوگا کبھی!
تکلف کی اللہ حسد ہے کوئی!
یہیں پرکھڑے ہو گئی اک صدی!

”بس اب پہلے آپ!“

”اجی پہلے آپ!“

”ارے ہو گیا بند جنت کا در
خدا یا بت جائیں اب ہم کدھر؟
نہیں واپسی کے سوا کچھ مفسر
چلو بھائی واپس چلیں اب مگر

”ذرا پہلے آپ!“

”اجی پہلے آپ!“

اجی پہلے آپ

”اجی رکھیے جنت کے در میں قدم!“

”اجی پہلے آپ!“

اجی واہ پہلے نہ جائیں گے ہم

”بھئی پہلے آپ!“

”اجی بات اس میں تکلف کی کیا
شہدوم مبارک بڑھائیں خدا
اجی چلئے۔ رک جائے گی سب جگہ“

”اجی پہلے آپ!“

”بھئی پہلے آپ!“

اجی بڑھ بھی چکئے خدا کے لئے
بس اب تو جنت میں ہیں جا چکے

اُونگھ

جنت کے پیارے جنگل میں ٹھنڈی ہوا میں جھوم رہی تھیں
رنگ برنگ چُنریاں پہنے حوریں ہر سو گھوم رہی تھیں

نیلی دھوپ میں استادہ تھے جنت کی مسجد کے منارے
گنبد پر پہ واہ کُتاں تھے نئے نئے پنچھی پیارے

چوڑن کے اک پیر کے نیچے دودھ کی جھیل کے پاس اک کُلا
علوے کے اک ڈھیر کے اوپر سر کو جھکائے اُونگھ رہا تھا،



میں اور شیطان دیکھ رہے تھے

جنت کی دیوار پہ چڑھ کر میں اور شیطان دیکھ رہے تھے
جو نہ کبھی ہم نے دیکھا تھا ہو کر حیراں دیکھ رہے تھے

وادی جنت کے باغوں میں اُن تو یہ اک حشر بپا تھا
شیطان کے ہونٹوں پہ ہنسی تھی میرا کلیجہ کانپ رہا تھا

میں نہ کبھی بچوں کا تو یہ میں نے دیکھا ہونٹا را
"لعنت! لعنت! بول رہا تھا جنت کا ہر منظر پیارا

موٹی موٹی توندوں والے بد صورت بد ہیئت مَلا

خوف زدہ مردوں کے بیچھے بھاگ رہے تھے کہہ کے "ایمان!"

"بیچ کے کہاں جاؤ گی؟" کہہ کے وہ دیرانے تاپتے گاتے
چار طرف سے گھیر کے ان کو ہنستے، کڈکتے، شور مچاتے

ڈر کے چیمیں مار رہی تھیں حوہیں ریشمی ساڑھیوں والی
ان کے دل دھک دھک کرتے تھے دیکھ کے شکلیں اڑھیوں والی

میں اور شیطان لب پہ دعائے "اے اللہ بچانا ان کو
اپنے رحمت کے پرشے میں اے معبود چھپانا ان کو

جہنم میں غنڈے

زشتوں نے جب مجھ کو دوزخ میں پھینکا ڈسا مجھ کو ایک سانپ نے پہلے آکر
پھراک کالے بچھو نے "جنگلی" میرے لی پھراک بھڑنے کاٹا مجھے مسکا کر

جہنم کے بلکے ہوئے پالیوں نے مجھے دیکھ کر قہقہے خوب مارے
چڑیلوں کے دادا یہ بھتنوں کے نانا لگے کہنے "کیسی طبیعت ہے پیارے؟"

بھویں تن گئیں میری غصے کے مارے کیا میری فطرت نے مجھ کو اشارا
جہنم کے ایک ایک باسی کو میں نے وہیں پر پھپھاڑا، وہیں خوب مارا

اٹھائی وہاں میں نے ایسی قیامت جہنم کے باسی جہنم سے بھاگے

میں لوہے کا لٹھرے کے تھاپے پیچھے وہ اکھڑے قدم لے کے تھے اگے اگے

گئیں ٹوٹ اُن نامرادوں کی کمری بہت اُن کی آنکھوں نے اُنسو بہائے
ہر ایک کہہ رہا تھا بچاؤ بچاؤ ارے مر گئے مر گئے ہائے ہائے!

جہنم کے لوگوں کی دیکھی یہ حالت تو شانِ کبریٰ کو رحم اُن پہ آیا
نکا لو نکا لو "اسے" جلد باہر! یہ کہہ کر جہنم سے مجھ کو بھگایا

"چلو یا رہنما چلو کرشن پنڈرا! یہ کہہ کر وہاں سے ہوا میں روانہ
ہمیں دُور سے کر رہا تھا اٹھائے ہر شام جنت کا موسم ہسانا

جب شام جنت میں ہوئی

جب شام جنت میں ہوئی

باغوں میں ہر سو گھوم کر

حدیں مری گھر آگئیں

چوہا ہر ایک کا میں نے منہ

چمکار کر کے بچکار کر

میں نے انہیں بھٹلایا

پہ جب گناہیں نے انہیں

جو سب سے پیاری اُن میں تھی

تھی وہ ہی گم

رہتا تھا گھر کے پاس ہی

جنت میں حسینوں کی بھوکھڑاں

(۱)

واردتہ جنت۔

اے بہت سی خوب صورت عورتوں
 مر لفتاؤ گرنہ کچھ کھاؤ گی تم
 کس کی یاد آتی ہے تم روتی ہو کیوں؟
 آنسوؤں سے تمہوٹے کتنے رومال
 اس طرح جنت میں آہیں مت بھرو
 ایک دن جنت میں مرجاؤ گی تم
 سات کوکانٹوں پہ تم سوتی ہو کیوں؟
 یاس سے گملا گئے ہیں سسرخ گال
 جو تمہیں تکلیف ہے بچھ سے کہو
 وادی جنت میں بھوکھڑاں کی مت رہو
 صف بہ صف دیکھو یہ بیڑی کے پہاڑ
 ان کو کھاؤ لے کے تم گھونگھٹ کی اڑ
 جگ گائیں ان پہ چاندی کے ورق
 ہم نے پھڑکے ان پہ پھولوں کے عرق
 دُردھکی جھیلوں بہ بالائی بھی ہے
 کھوٹے کی بظنوں پہ رعنائی بھی ہے

کافر ادا اک مولوی
 میں نے گرج کر یہ کہا
 اس سے کہ "ادلعون ادھر
 آؤ ذرا

سچ سچ بتا کیا بات ہے؟
 دستہ دلوچوں کا تڑا موٹا گلا



سیر کر لوئے کے اک مصری کی ناؤ
 جو ہڑوں میں موتیوں کی بھیر ہے
 ہر طرف شربت کے نوآروں کا شور
 رس گلے سرکوں پہ ہیں بھرے ہوئے
 اسے حسیں پر یو! انہیں چن چن کے کھاؤ
 دیکھو یہ گاجر کے حلوسے کے محل
 توڑ کر اک اینٹ چکھو تو سہی
 یہ نہیں پر بت یہ میں سوٹن کے کیک
 یہ شکر کی ہے سرک کھا جائیے
 آرہے ہیں دہہ جو شتر پے ہمار
 پیڑ جنگل کے ثمر بردوش ہیں
 دم یہ لنگڑے ہیں پر لنگڑے نہیں
 توڑ لو بیڑوں سے یہ خوبانیاں
 نختے پنچی سب تھامے ہیں غلام
 میٹھی میٹھی ہے ہوا جنت کی اکھاؤ
 "خوابِ مہنتی" کی یہی تعبیر ہے
 ناچتے ہیں ہر طرف برنی کے مور
 جیسے تائے عرش پر نکھرے ہوئے
 ان پر یہ نکیلیں آنسو مت گراؤ،
 واہ ری بزمِ خدائے عزوجل،
 پیٹ میں اک اینٹ رکھو تو سہی
 کھاؤ ان کو کر سیوں کی لے کے ٹیک
 میٹھے کسکر توڑیں جاں فرمائیے
 لارہے ہیں یہ مر پتے بے شمار
 مت ڈر و میدے کے یہ خرگوش ہیں
 طوطوں سے پوچھو نہ گرائے یقیں
 مت کرو بیکار آنا کانیاں
 چاہو تو ان کو پکارو لے کے نام

اپنے اپنے اشیانے پھوڑ کے
 سب کے سب پھل تم کو یہ کر دیئے پیش
 اپنی چونچوں سے کھلائیں گے تمہیں
 لاٹیں گے جنت کے یہ پھل توڑ کے
 مطلقاً ان کو نہیں کچھ من کر خویش
 رو رہی ہو تم ہنسائیں گے نہیں

گر حسینوں کو نہیں میٹھا پسند
 میں ابھی حاضر کروں کچوال چنڈا

(۲)

یہ مجلس کے نان، یہ شامی کباب
 شور یا ہدھد کا تقوڑا پیجئے
 کوفتے بگلے کے یہ چکھیے ذرا
 ہنس کے یہ گھونگھٹ ذرا سرکائیے
 یہ شتر مرغوں کے انڈے ہیں حضور
 ضد نہیں کیجئے اجی باز آئیے
 نختی چڑیوں کے سری پائے ہیں یہ
 یہ دل بلببل کا ایرانی اچار
 ہو کے تو کھائیے عالی جناب
 کچھ سپلاؤ ہی تناول کیجئے
 اک اٹھا کر منہ میں تو رکھیے ذرا
 "نہر الفت" کی یہ پھلی کھائیے
 تاب میں رکھا ہے مرغِ کوہ طور
 مور کا تقوڑا متنجق کھائیے
 خوش ہوا ہے جس نے بھی کھائے ہیں یہ
 لے وہ پٹھارے جو کھائے ایک بار

یہ دُعا کی پیاز یہ عربی سلاخ کھائے جو برسوں کے وہ اس کی یاد
 جسم گرمی سے اگر گھبرائے ہیں ہم چمکتے مور تھپل بھی لائے ہیں
 دادی جنت سے کیوں بیزار ہوا خود کشتی کرنے پر کیوں تیار ہو؟
 بات کیا ہے دُعا تو بہت آؤ جوڑنا ہوں ہاتھ غصے میں نہ آؤ
 اٹک کیوں چمٹے ہوئے ہیں گال سے
 پونچھ ڈالو ریشمی رومال سے

(۳)

عورتیں :-

جاؤ جاؤ کچھ نہیں کھائیں گے ہم فیصلہ یہ ہے کہ مرجائیں گے ہم
 عورتیں سب سیدی راہوں پر چلیں نیت نیکی بن کے دنیا میں چلیں
 گھر سے باہر پیش جب کرتے تھے مرد گھر میں ہم بھرتے تھے آہیں سرد سرد
 ہنس کے سہ لیں زحماتیں اولاد کی ہم نے دنیا سے حُدا آباد کی
 کر دیا پورا ہر ایک حکم حُدا اُس کا ہر سرا ہم لائے بجا

مکمل تھا شوہر محبازی ہیں خُدا اُن سے ہو سکتی نہیں عورت جُدا
 ہم تھے سیدھے آگیا ہم کو یقین کھتی خبر کس کو حقیقت یہ نہیں
 اُن کی اُلفت اپنی فطرت بن گئی گھر کی دوزخ اپنی جنت بن گئی
 چونکہ کھتی شوہر پرستی فرض عین اُن سے پٹ پٹ کر ہمیں آنا تھا چین
 اب تو ہر عورت فدائے مرد ہے اپنے اپنے مرد کی ہمدرد ہے
 آج جب ہر نگاہ محشر آگیا سامنے کچھ اور نقشہ چھا گیا
 یک بیک دشمن ستارے ہو گئے مرد سب دوزخ کو پیار سے ہو گئے
 ہو گئے گمراہ ان بچاروں سے گناہ کر رہے ہیں آپ کیوں ہم کو تباہ؟
 دل تھلا کیوں دیں گے بیگانوں کو ہم پیٹ دیں گے آج علمائوں کو ہم
 ہم کو دیکھیں تو یہ ان کی یہ مجال نوح دیں گے ان کے لیے لمبے بال
 اپنا اپنا ہم کو گھسنا چاہیے کچھ نہیں بس ہم کو شوہر چاہیے
 وہ ہیں بھوکے اور ہم جنت میں کھائیں وہ جُدا ہیں اور ہم خوشیاں منائیں
 کچھ بھی ہو وہ ہیں شریک زندگی زندگی میں اُن سے ہے تابندگی
 سچ تو یہ ہے وہ نہیں کرتے گناہ دوستوں نے کر دیا اُن کو تباہ

رشید احمد کے گھر دعوت اڑا کے
 مری کلبیا میں وہ بیٹھی تھی نگلیں
 نہ دودن سے ملا تھا اس کو کھانا
 حبیب سا ایک مصرع گنگنا کے
 "وزیر آغا کی تازہ نظم سنو لو
 اب اس کے صبر کا پیمانہ چھلکا
 وہ غصے کی شکن ماتھے پہ لائی
 ترے ساتھ آگئی پھوٹے مئے بھاگ
 ارے چھوٹی سی تھی میں نظم آزاد
 ادب نے کر دیا برباد تجھ کو
 زباں پر ذکر ملتو دن میں دس بار
 لحاف اک بھی نہیں او مذکر عصمت
 تبسم واجدہ کا کیا کروں گی؟
 مراد دل بھوک سے رنجور اگر ہے
 کلام میر بھی ہے جوش بھی ہے
 ہوتا میں گھر میں داخل مسکرا کے
 کہا میں نے "ہو کیسی بلبلی چیں آ
 مگر یہ راز بندے نے نہ جانا
 کہا میں نے یہ اُس کے پاس آ کے
 ذرا کچھ شاعری کے پھول چمن لو
 پڑا پیلا، گلابی رنگ ہلکا
 معاً دینے لگی وہ یوں دھانی
 وزیر آغا کی نظموں کو لگے آگ
 کیا پابست تو نے مجھ کو جلا د
 نہ اپنے ساتھ کرنا شاد تجھ کو
 کبھی لا کر نہ دی اک "کالی شلوار"
 بتا دے یہ کہاں کی ہے شرافت
 میں اُس سے پیٹ کیا اپنا بھروسہ گی؟
 مجھے کیا باجسہ مسرور اگر ہے
 نہیں ہے گھر میں اٹا ہوش بھی ہے؟

اگر فاتوں سے آیا غیظ مجھ کو
 ہوئی جب چائے کی بندی کو خواہش
 نہ مجھ ناشاد کی پروا کبھی کی
 کبھی آنسو نہ بندی کے سکھائے
 اگر تجھ کو نہ دیتا داد داری
 کیا ہے جھنری نے تجھ کو برباد
 صلاح اللہین اگر کٹیا میں آیا
 بہت سود ادب کا سر میں ہوگا
 نہ گھر میں سخت رالایاں آئے
 اُسے چاٹو گے جو موگے یہ ہے طے
 یہاں پر منتظر ایو بی جو آیا
 دکھاؤں گی میں اس کو ایسے نشتر
 جو راشد کی سنائی رنظم آزاد
 بڑی مشکل سے پیچھا تھا چھٹ آیا
 مرے وہ اشترائی احمد عباس
 سنایا فیض احمد فیض مجھ کو
 کہا "پڑھ لو ذرا حسان دانش
 جو کی آفسر شاد امرتسری کی
 بڑے صوفی تبسم بن کے آئے
 نہ آتی میرے گھر پر یہ تباہی
 جو آ کر دے گیا جھوٹی تجھے داد
 تو سمجھو میں نے واوبلا چھایا
 وہ مولانا اگر ہے گھر میں ہوگا
 نہ اپنا وہ یہاں ایمان لائے
 مگر وہ جبر اسود تو نہیں ہے
 سمجھ لو میں نے ڈنڈوں کو بھیگایا
 کہ سنتا آئے گا جائے گارو کر
 ترے ساتھ اُس کو بھی کر دوں گی برباد
 وہ کیوں ایران جا کر لوٹ آیا
 وہ کر دے گا تیرا بھی سنایا تا اس

تو تے اُن کی شرافت لے کے باٹ بعد میں کرتے اُنہیں دوزخ الاٹ
 دی سزا اور کچھ نہ کی انکوائری یہ تو ہے "سراٹکل ادوا سری"
 سب فرشتوں کی غلط ہے ڈائری کچھ حقیقت اور زیادہ شاعری
 کیا وہ کرتے اُن پر جب آیا شباب کچھ چھنا لوں نے کیا اُن کو خراب
 بزم دنیا میں بھی یہ تھیں اُنکے ساتھ آگے دوزخ میں ہی یہ اُنکے ہاتھ
 کھولتا ہے خون وہ آیا ہے طیش ہو رہے ہوں گے جہنم میں بھی عیش
 نعرہ برب ہاتھ میں ہیں جھنڈیاں لے چلو جی ہیں جہاں وہ زندیاں
 دیکھتے ہی اُن کو اٹھ جائیں گے ہات زور سے دیں گے مگر یہ ایک لات
 کھٹ سے جب گھونسا پڑے گا تاک پر روکے گر جائیں گے فرشِ خاک پر
 جب پڑے گی پٹیٹھ پر لوہے کی سیخ اِن چھنا لوں کی نکل جائے گی چسیخ
 آج دوزخ میں وہ ہوگا قتل عام روئیں گے سب سانپ اور کچھو تمام
 لمبی لمبی لاکھیاں چل جائیں گی پوتیوں کو تانیاں یاد آئیں گی
 ساڑھیاں اور بلاؤں سب پھٹ جائیں گے چوٹیوں کے ساتھ سرکٹ جائیں گے
 کر کے اُن کی لمبی زلفیں تازتار ہم پہنائیں گے اُنہیں جوتوں کے ہار

"دلسوں" کو اُن پہ ہم بٹھلائیں گے لنگڑے اور کانے گدھے منگوائیں گے
 اِن کو پھر بلوائیں گے تھوہر کا جوس ہر جگہ اُن کا نکالیں گے جلوس
 تمام لیں گے پھر گریبانوں سے ہم بیاہ دیں گے اُن کو شیطانوں ہی ہم
 شوہروں کو آج واپس لائیں گے ہم کھلا کر اُن کو پھر خود کھائیں گے
 ہاں کھڑی ہو جاؤ اب تم صاف صفت کوٹھ کر دو اب جہنم کی طرف

"زور سے بولو کہ شوہر زندہ یاداً"

"شوہروں کی بیویاں پائندہ یاداً!"



حسین کا لی گھٹا لہرائی جب بھی صحن گلشن پر
تو اس عالم میں مے خانے کا مے خانہ چہ پائیں نے
مگر سب کے بڑا یہ جرم میرا ہے میرے آقا
غلط اک قافیہ دیواں میں اپنے لکھ دیا میں نے



شاعر خدا کے دربار میں

تیری دنیا میں سوں لے آج تک کیا کیا میں نے
کوئی چھ سو ستاون مہ رُخوں کو دل دیا میں نے
شبستانوں میں میرے رات بھر اکثر ہیں پریاں
مدار و دشمن رکھا اپنے گناہوں کا دیا میں نے
برہنہ لڑکیاں جب میرے آگے رقص کرتی تھیں
راہنی آنکھوں سے کوئی اُن کے جسموں کی ضیائیں نے
میرے گستاخ ہونٹوں پر بُتوں کے نام لہتے تھے
تیرا جب نام آیا اپنے ہونٹوں کو سیا میں نے

میرا دوست

اسلام سے ہم ہم دیرینہ شیطان الرجیم

ہر ادا پر تیری عاشق ہے میرا ذوق سلیم

تُو نے بن مانگے ہی پوری کی میری ہر اک مراد

ہوں اگر انسان پہ احسان ہیں رکھوں گا یاد

سب تیرے دشمن ہیں لیکن میں ثنا خواں ہوں تیرا

اے عظیم الشان افسانے میں عنوان ہوں تیرا

مرجا صد مرجا اے شاطر افلاک وارض

حکم دے مجھ کو تو میں پوسے کر دوں کچھ تیرے فرض

بزم عالم میں نہ قدرت تیرے سکی تجھ کو شکست

تُو نے تپٹ کر دیا ہے انتظام جو دو ہست

دید بہ پھیلا ترا صحرا بہ صحرا ایم بہ ایم

نیکیوں کو روند دیتے ہیں تیرے وحشی قدم

رحم آجاتا ہے تجھ پر کس قدر مصروف ہے

اس پہ طرہ یہ کہ اُس دربار سے موقوف ہے

کچھ بھی ہو رہتی ہے ان آنکھوں کو تیری جستجو

آگے بل لیں، پڑانے دوست ہیں ابیں اور تُو

کہہ کے میں اللہ اکبر جب بھی پڑھتا ہوں نماز

میرا کچھ نوٹس نہیں لیتا خدائے بے نیاز

سراٹھا لیتا ہوں اگتا کر میں اُس دہلیز سے

خاک دل چسپی "وہ" لے اک بندہ ناچیز سے

جب بلاتا ہوں تجھے اک پل میں آجاتا ہے تُو

راستہ سیدھا ہو یا الٹا بتا جاتا ہے تُو

"وہ" ہے کتنی دور اور تُو کس قدر نزدیک ہے

"وہ" ہے اوروں کے لئے میرے لئے تُو ٹھیک ہے

میرے مُرشد کب تک تیرے لئے آہیں بھروں؟

تو نظر آئے تو ہاتھوں پر تیرے بیعت کروں،

حشر کے دن جانِ جاں دھوکا نہ دے جانا مجھے

بزمِ دوزخ میں بھی اپنے ساتھ لے جانا مجھے

تو نہیں مانے گا میری تو حرام اللہ ہے

تو مصیبت ہے اذیت ہے بلا ہے تر ہے

بھاگ جا میں تیرے دھوکے میں نہ ہرگز آؤں گا،

میں نہیں آؤں کہ تیرے حال میں پھنس جاؤں گا



مثنوی قمر البیان

شاعر اور بیاد غار

وزیرِ آغا سنو میری کہانی اگرچہ یہ مسلم کی ہے زبانی
کہانی درد سے بھر پور ہے یہ کہ تصویرِ دلِ بچد ہے یہ
دمِ آغاز "دونہرے اور اک" واہ دمِ انجام "دونالے" اور اک "آہ"
جو تارِ دل پر رکھ دی ہیں نے مفراب تو مگر آؤ گے سر ہو ہو کے بنیاب
یہاں دو گے یکا یک اشک اتنے فلک کی آنکھ کے تارے ہیں عجب
مرا کوئی نہیں ہر رات تم سا میں ڈھونڈوں گا کہاں مساز تم سا
ابھی سے رپڑے پھیرے یا نہ اتنا رو ہو جاؤ گے بیار

ہوئے جاتے ہوتے کیوں پانی پانی ذرا رو کو یہ اشکوں کی روانی
 ذرا کچھ دور ہٹ جاؤ مرے یار قلم کی اب چلاتا ہوں میں تلوار
 بنام شاہد "نازک مزاجاں"
 بطیب خاطر ظالم "سماجاں"

آغازِ داستان

یہ کوئی چھ برس پہلے کی سی بات نہ تھی جب فکر کوئی مجھ کو دن رات
 میں بے فکری سے دن بھر گھومتا تھا پیسے بن ہر قدم پر بھونکتا تھا
 مری دنیا میں آئی اک حسینہ پھنسی جیسے انگوٹھی میں نگینہ
 ریاضِ خلد کی ہنستی کلی تھی بڑے ناز و نعم میں وہ پتی تھی
 بہاروں کی حبیب مسکان تھی وہ بلا تھی، اتر تھی، طلوت ان تھی وہ
 مرے چہرے پر اس کو رحم آیا نظر ملتے ہی اس نے دل ملایا
 جو میں نے مسکرا کر اس کو دیکھا تو جھٹک کر کی سو اس نے پھول پھینکا
 نگاہیں پر گئیں وہ میرے پیچھے وہ تھیں بے چین اوپر اور میں نیچے
 ادائیں اس نے دکھلائیں جو ہنس کر مراد رہ گیا زلفوں میں پھنس کر
 چھڑی آفت زلفت کی کہانی
 مگر فی الحال اشاروں کی زبانی

ادراں کے بعد

قدم اب عشق نے آگے بڑھائے جو آراں دل میں تھے ہو توں پر آئے
 ملاقاتیں ہوئیں دو چہرے چھپ کر محبت کے ہوئے اقرار چھپ کر
 وہ بولی "ہر مصیبت میں سہوں گی خوشی سے تیری گنایا میں رہوں گی
 میں لعنت بھیج دوں گی اپنے گھر پر چلی آؤں گی میں سب لے کے زیور
 یہ سن کر میں نے کی جب کچھ پس پیش وہ بولی سمت کروں کر کم و بیش
 بہت کچھ نقد بھی لاؤں گی پیار سے مری لاکھوں امیدوں کے مہارے
 محبت کا خزانہ ہوں چسرا لو مجھے فوراً اب اس گھر سے بھگا لو
 بہت کچھ آ رہے ہیں گھر میں پیغام نہ ہو جائے جوانی میری نیلام
 نہ تڑپاؤ مجھے جسلا دین کر کہیں اب لے چلو فریاد بن کر

میرا انقوا

ٹی ندیا پہ مجھ کو دوسرے دن لگی کہتے "رہوں گی اب نہ تجھ بن"
 کہا میں نے "اسے میں تو ہوں شاعر" وہ بولی "یعنی دل لیتے ہیں ماہر؟"
 "مگر" کہہ کر جو میں نے سر جھکایا مری سمت اس نے ہاتھ اپنا بڑھایا

کلائی تھام کر بولی "چھڑا تھ" ارے دست نہ لیتا ہے مرا ہاتھ
 پکڑ کر مجھ کو لے آئی مرے گھر پسینہ آگیا میری جبین پر
 لگی کہنے "ملے کس ناز نہیں سے؟" پسینہ پونچھے اپنی جبین سے
 ندی پر سے تجھے بت رہی اڑ لائی تجھے میں تیرے ہی گھر میں بھگا لائی
 مرا گھر کیا تھا؟ اک چھوٹی سی گٹیا
 یہیں ڈوبی مری قسمت کی گٹیا

"طوفان" بہ "جناب" اندر

حسین توں تزع گھر آگئی تھی یہ بدلی سب جہاں پر چھا گئی تھی
 ملائی جب وہ آنکھیں ہو کے دم موش محبت کھول دیتی ہنس کے آغوش
 میں سن کر اُس کے پائل کی چھا جھم بہا دیتا خوشی میں دل کا ہر عنص
 جب اُس کی چوڑیاں ٹکرا کے بختیں ہزاروں دلتیں سی دل میں سمجھتیں
 سرورِ سردی تھی اُس کی آواز کہ جیسے سچ ہے ہوں سینکڑوں ساز
 مرا سرگم تھی وہ سنگیت تھی وہ غزل تھی وہ سراپا گیت تھی وہ
 جب اُس کے دیکھتا ہندی رہے پاؤں میں کہتا "الہیہ کرنے کے لئے آؤں؟"
 وہ جب اُن سر مئی آنکھوں سے نکلتی جنوں بن کر محبت سر پہنچتی

لیے شانوں پر زلفوں کی گھٹائیں لگا کر خط لکھتی دانتیں بائیں
 وہ رعبِ حسنِ اس بندے پر چھانا کہ بندہ دُور ہٹ کر ہنس جاتا
 مگر اک روز جرات سے لیا کام محبت سے لیا اس شوح کا نام
 کہا پھر میں نے اُس سے تمام کرات "ادھر دیکھو آج ہے کتنی حسین رات
 حیا کے پھینک دے رنگین پردے مجھے ہر قسم سے آزاد کر دے
 میں کیسے اتنے ارمانوں کو روکوں؟ میں کیوں کر آئے طوفانوں کو روکوں؟
 بڑھی وہ میری جانب ہو کے مدہوش ریاضِ خلد تھی شاعر کی آغوش
 مجھے نے دی نویدِ وصلِ اُس نے پلا ڈالی "شرابِ اصل" اس نے

وہ دُلمن سی بنی ہر رات میری
 عجب ہر رات تھی مہبات میری

عہدِ بہمان

غم و اکام سب سوئے ہوئے تھے نہ جانے ہم کہاں کھوئے ہوئے تھے
 مبرا اک پل بھی وہ مجھ سے نہ ہوتی خوشی سے رات بھر ظالم نہ ہوتی
 گکھے میں ڈال بانوں کا حیدیں ہار جنگا دیتی مجھے شب میں کئی بار
 نگاہوں سے وہ کرتی یہ اشارے نہ سوؤں گی نہ سونے دوں گا بیایے

مجھے وہ وہ ادائیں وہ دکھاتی خوشی میں کشتی دل ڈوب جاتی
 کھلا کر آرزوؤں کا وہ گلزار یہ کہتی "امرے پسلو میں دلدار
 "اگر فردوس بردہ سے تین است ہمیں است وہیں است وہیں است
 کبھی شاعر جبراً مجھ سے نہ ہونا نہ اپنی عساشقی کی لاج کھونا
 ترے بن ایک پل جیسا ہے دشوار جہاں فانی، نہیں فانی مرا پیار
 کسی دن کھو دیا اگر میں نے تجھ کو سمجھ لے موت آجائے گی مجھ کو
 میں ترے ساتھ فلتے بھی کروں گی

تری آنکوش میں ہنس کر مروں گی

ہر روز روز عید

نہ بھتی کچھ کرم کو مال و زر کی حقیقت سے محبت بے خبر تھی
 بچے زلیور۔ مرے ہم نے اڑائے وقا کے گیت ہم نے گنگائے
 نہ کھائے تھے کبھی ہم نے جو کھلنے کھلائے پیٹ بھر بھر کر خدا نے
 پھری مرغی پہ چلتی دن میں دو بار تھی دسترخوان پر کھانوں کی بھرمار
 مرے گھر دودھ کی ہنری تھیں جاری پھلوں کے گورے تھے بھاری بھاری
 میں میں سیبوں کا پتیا دن میں دس بار مٹھائی کے لگے رہتے تھے انبار

عجب دن تھے عجب تھیں پیاری تریں زباں پر ہر گھڑی لاکھوں کی باتیں
 کہا جب دل نے جھٹکیں مگالیں ہزاروں ہم نے فلمیں دیکھ ڈالیں
 سدا ہم ٹیکمیوں میں گھومتے تھے وہیں اک دوسرے کو چومتے تھے
 گئے کپڑے پرانے سل گئے سوٹ گئی چپل پرانی۔ آگے یوٹ

ہوشے معلوم سینٹ اور عطر کے بھاؤ
 سنی جتنی بھی قیمت جھٹ کہا: لاؤ

میں اور میں

ملازم پانچ رکھے میں نے ہشیار سلام اُن سے کرانا دن میں چھ بار
 ملاقاتی جو میرے گھر پہ آتے وہ اکثر منہ کی کھا کر لوٹ جاتے
 مرے در پر کھڑا رہتا تھا جو "گارڈ" وہ کہتا اُن سے لاڈور ٹینگ کارڈ
 بغیر اس کے نہیں ہوتی ملاقات یہ سب سرکار نے دی ہیں ہدایات
 نہ ہوتا موڈ میں اُس وقت اگر میں تو کہہ دیتا کہ "صاحب گھر نہیں ہیں"
 بہت کم اب ملا کرتا میں گھر میں کہ ہوتا "والسرائے کے ڈنر" میں
 میں اکثر چار کو اب نور کتا جی بس کیجے کو "او نومور" کہتا
 گئی سب خاکساری، آگئی میں "کہ یون اے کے سگریٹ پھونکتا میں

محلے کے امیڈوں سے اجھتا انہیں اُو کے پٹھے میں سمجھنا
 مرے گھر سب ادیب آجا رہے تھے
 مزے سے رات دن پی کھلے تھے

آسمان کی حرام زدگی

نہ بھایا آسمان کو گھر کا یہ رنگ بیکایک آپڑی اس رنگ میں بھنگ
 وہ زیور ہی تھے، کتنے روز چلتے دیا بھجنے لگا یہ جلتے جلتے
 غریبی نے جو دی اس گھر پہ دستک سُنائی دی دلوں کی ہم کو دھک دھک
 بیکایک چونک اُٹھے گھر گئے ہم ارے اب کیا کریں بچ کر اگے ہم
 مجھے محسوس اب ہونے لگا یوں کہ سب بیکار تھی میری اکڑوں
 جب اُسے گھر میں فلتے سُکر اکر ہوئی وہ غرق سُکر آنکھیں جھکا کر
 دیا عاشق کا پھر بھی ساتھ اُس نے نہ بھٹکا عاشقی کا ہاتھ اُس نے
 بیکایک ہو گئے سب طور بے طور عجب تھا زندگی کا یہ نیا دور
 وہ روکھی روٹیاں اب کھا رہی تھی چھنا ب بھاڑ سے بھنوار ہی تھی
 وہ ستو پھا نہ تھی، گتیاں چباتی مجھے تکتی، جباتی، سُکراتی
 وہ کہتی پھر گلے میں ڈال کر ہاتھ "بہت ہی خوش ہوں میں ہ کر رہے ساکت"
 میں کہتا "واہ! کیا لڑکی ملی ہے کئی جنت کی دوزخ میں کھلی ہے"

رہے نام اللہ کا!

گٹالے لے کے قرضہ کچھ زمانہ چلا کچھ روز یونہی اسب و دانہ
 کہاں تک قرض ہم لے لے کے جیتے سسکنے اب لگے دلہ زندگی کے
 نہ شاعر کو کسی درس سے ملا کام ہر اک درس سے وہ لوٹا ہوس کے ناکام
 بچیں گھر ٹریاں، بچے زیور بچے سوٹ کبھی گروی پڑی سارھی کبھی لوٹ
 پڑا سامان کچھ گروی، بچا کچھ نہ اللہ کے سوا گھر میں رہا کچھ
 یہ بھی جاتا رانغا حسان کے نام ہوئی جاتی ہے عزت میری نیلام

خدا را کچھ مدد بندے کی کیجے
 نہیں تو دور و پلے ہی پہنچ دیجے

قرض خواہوں سے تنگ

کیا اب قرض خواہوں نے مجھے تنگ بہت روکا انھیں پر ہو گئی جنگ
 مگر تھا وصلے والا بڑا امیں مجاہد کی طرح اُن سے لڑا میں
 کسی کو اپنے گھولنوں سے بچھاڑا کوئی ترچھا گرا اور کوئی اڑا
 کسی گنجرے کو دے کے بھیجا گالی کسی کی جیب سے نقدی اڑالی
 جو گھر میں رز دے جاتا تھا اندے گیا وہ تڑکے تڑکے کھا کے دھڑے

کسی ختم ٹھونک کر آئے جو آگے
 دوتی دے کے بھنگی کو رلایا
 بہت ظلم اس "عقبنی عمنہ" نے دھائے
 خدا اس کو جس ختم سے بچائے
 کہو اے پڑھنے والو مل کے آہیں
 کہو شانِ کریمی کی نہ توہیں

حسیلینہ سے میری پہلی مکاری

یونہی گزرے کئی دن اور راتیں
 تھا اپنے شہر کا شاعر بڑا ہیں
 میں بٹیری پھونکتا رہتا بہ آرام
 جب اس کا بھوک سے دم لب پر آتا
 عجب سو بھی مجھے اک روز تدبیر
 یہ سوچا شاعری اس کو سکھا دوں
 بنادوں اس کو بھی خاتون کا عادی
 کوں لے تو بھی اب رورو کے دن کلٹا

پہنچے ایسی کہ پھر جانے نہ پائے
 یہیں پر بیٹھ کر گریں "لگائے"

پہلا سبق

دیا پہلا سبق اس مہ لفتا کو
 بتایا کیا ہے "سکتہ" کیا ہے "ابہام"
 ہے "ایضائے جلی" کیا اور "صحنی" کیا
 میں کہتا "جاہلاتن جہا ہلاتن"
 جب اس کا دیکھتا میں پھول سا مٹنہ
 بہت ہی اس کو جب بحر میں سکھالیں
 قصیدے ذوق کے اس کو "پلائے" اسے غالب کے سہرے بھی لنگھائے

دیے پھر شاعری پر ایسے لکچر
 سنے جو اس پر ی پیکر نے منس کر

شاعر اصلی کی تعریف

کہا میں نے کہ جو شاعر ہے اچھا
 نہ ہرگز زندگی میں کچھ کرے کام
 سدا وہ زندگی برباد رکھے

ضرداری ہے کہ ہو اُلو کا پھٹا
 ہر اک در سے وہ ہو کے لوگے ناکام
 جو ممکن ہو تخلص شاد رکھے

پڑھائی "اُس نے چھوڑی ہو آدھوری
 ہے" اورچ شاعری "فاقول سو مرنا
 بڑے معشوق کی صفیتیں کرے وہ
 اگر تو بد چلن بھی اُس کا معشوق
 خوشی سے یہ کہے تو بے دغا ہے
 بھرے سروا ہیں دل کو تمام کر وہ
 کوئی تیر نظر دل میں لگا ہو
 مکھے غزلیں کرے پیدا وہ بچے
 سدا بھوکے اٹھیں بھوکے وہ سوئیں
 حمیں بیوی کے کپڑے مل گئے ہوں
 رکھے پتلون گروی اور پئے سے
 کھلے رکھے وہ شب کو اپنے دیدے
 پھر اپنے پر چھڑی اس طرح چلوائے
 غزل اپنی ترقم سے سٹائے
 کلام اُس کا اگر کرنے لگے یور
 نہیں تسلیم اُس کو کچھ ضروری
 فلک پر روکے ہر الزام دھونا
 وہ کیسا بھی ہو بس اُس پر مرے وہ
 نہ مائے اس کو لاٹھی اور نہ بسندوق
 مگر پھر بھی مرا یہ دل ترا ہے
 بنا رومال روئے رات بھر وہ
 "نغم درو جگر" ہیں مستلا ہو
 جو ملن ہو تو دودو ہوں اکٹھے
 اگر روئیں تو سب وہ مل کے روئیں
 اور اس کے منہ پر پونے چھینچے ہوں
 بالآخر بیچ ڈالے اپنی ہر شے
 گئے تائے، مکھے سہرے قضیہ
 کلام اپنا کہیں بھی مفت چھپوائے
 اگر ملن ہوتا نہیں بھی لگائے
 اگر محفل میں برپا ہو کبھی شور

نہ جی ہارے وہ پڑھتا ہی چلا جائے
 رہ ہمت میں بڑھتا ہی چلا جائے
 یہ سب سن کر لگی کہنے مری جاں
 "اور اس کا نام ہو مہادی علی خاں"

شاعری پر ایک لیکچر

کہانی اصل شاعر کی عتاکر
 نظر آئے نہ جو شے وہ کمرے
 لب معشوق ملتے ہیں میں ہیں
 نہ ہو معشوق کے گالوں پر گرتل
 نہ ہوں گرتل تو بنیے سے منگالو
 بچے کاتل کے جلووں سے کوئی کب
 جو دیکھے گا وہ ہو جائے گا برباد
 کوئی مجنوں بنے گا، کوئی فریاد

معشوق کی چال

کسی معشوق کی اپنی نہیں چال
 کسی کو مورنی چلنا سکھائے
 وہ اوروں کی ہے منت کش بہ حال
 کسی کو "فن" یہ بی ہرنی بتائے

کسی کی چال میں مستی اگر ہے تو سمجھو اس پر ہمتی کی نظر ہے
نہ آئے تم کو گر چلنا ادا سے توجہ کر سیکھ لو یادِ صبا سے

یہ پونے چھٹکے چلتی ہے پیاری
گلستاں درگستاں کیاری کیا ری

معتوق کی زلفیں

اگر تم کو کوئی ناگن نظر آئے تو یہ سمجھو کسی کی زلف لہرائے
مگر اس زلف سے نمود کو بچانا تھا راہ تھ اس کو مت لگانا
یہ چلتی پھرتی چلیا کاسے گی تمہاری زندگی سب چاٹے گی
کوئی زلفوں کو لمبی شب بنائے جو اندھوں کو نظروں میں بھی آئے

ہر اک مجرم نے جو پہنی ہے زنجیر
وہ واروغے کی ہے زلف گرہ گیر

قد محبوب

قدِ محبوب کتنا ہو بناؤں چلو اک سرو میں تم کو دکھاؤں
نہیں یہ بے جٹ چھڑا یا بڑا ہو ضروری ہے کہ گلشن میں کھڑا ہو
قیامت سے بھی ہے تشبیہ اسکی اگر چہ کچھ نہیں توجیہ اس کی

اچھی آنکھیں

جو اچھی آنکھ کی پھپھان چاہو کہیں سے پیول زنگس کا منگالو
نہ آنکھیں ہوں اگر بیمار آنکھیں سمجھ لینا یہ میں سبے کار آنکھیں
مگر یہ شرط بھی ہے ہوں گللابی بڑی جلتی کہ ساسر اور رکابی
بہت سے لوگ انہیں کہتے ہیں بادام

شرابی لوگ کہتے ہیں انھیں جام

منتزقات

اگر تم دو بہت چاہو مری جاں تو ہے اس کے لیے چاہ زخداں
کسی کے ہاتھ میں دیکھو جو تلوایے پھرتا ہے سمجھو ابرو سے یار
کبھی بجلی جو گرتی ہے فلک سے تو دن سینے میں رہ جاتے ہیں دکھ سے
اگر بجلی گرا دے منس کے معشوق نہ آئے گی صدا سے توپ و بنداق
سڑک پر گر نہ مٹی ہو نہ ہو دھول وہاں بکھرے ہوئے ہوں جا بجا پیول

سمجھ لینا حیس کوئی ہدنا ہے
"ابھی اس راہ سے منس کر گیا ہے"

عشق کا موسم

بونہی گزرے کئی راتیں کئی دن
 وہ بولی ایک دن دل میں اٹھی بڑک
 کہا میں نے کہ "لا دوں گا میں کھانا"
 ادھر آؤ سکھانا بعد میں بال
 تمہارا امتحان میں آج لوں گا
 وہ بولی ایک ٹھنڈی آؤ بھر کر
 جنوں اٹھتا ہے جب آئیں ہاں
 نہیں جلیں، یہ مرنے کا ہے موسم
 اسی موسم میں کھو جاتے ہیں شاعر
 تڑپتے ہیں بچتے ہیں وہ ہر سال
 مگر رہتی ہے وہ منہموم و خاموش
 قتلاروں میں رکھے رہتے ہیں گلے
 کرا لیتی ہیں کلیاں عشقی بالجبیر
 چمن میں آئیاں ہوتے ہیں اکثر
 عجب تھی زندگی خوراک کے بن
 میں بولا "کیوں، وہ جھٹ بولی" لگی ہوئی
 مگر پہلے "سبت" پچھلا سنانا
 سناؤ "عشق کے موسم" کا کچھ حال
 ہو نہیں سکتا پاس کھانا لاکے دوں گا
 مجھے پچھلا "سبت" سارا ہے ازیر
 چمن میں گل گریباں اپنا چار میں
 کسی سے عشق کرنے کا ہے موسم
 قفس میں بند ہو جاتے ہیں شاعر
 صبا سے پوچھتے ہیں یاغ کا حال
 یہ سر نہرا کے ہو جاتے ہیں بے ہوش
 کہ بھنورے کر سکیں کلیوں پہ حملے
 وہ ہر شئی کو ہسہ لیتی ہیں بالقبیر
 کہ جلی گری کے آؤ کے اُن پر

کبھی گرتی نہیں ہے یہ زمیں پر
 یہیں پر ان کے گاتی ہے قمری
 پہنیا بھی یہیں اندوہ گیس ہے
 یہیں پر بیوہ کو تل غم سے کسلانی
 صبا کا پوسٹ میں آتا یہیں ہے
 اسی موسم میں دل دے کر گلوں کو
 وہ ہو جاتی ہے اس موسم میں بہار
 بس اب میں تھک گئی ہوں لاؤ کھانا
 خدا کے واسطے جلدی متگانا

ایک اور لیکچر

مری جان تم سے سو گئی تھی
 وہ میری عقل پر رو دھو گئی تھی
 بصد منت اسے میں نے جگایا
 ذرا کھا کر کچھ آیا اس کو جب ہوش
 محبت سے بھٹا کر ساغدا اپنے
 کیس ایران جا کر کھو گئی تھی
 بہت ہی بوری شاید ہو گئی تھی
 "پلاؤ" اس کو متوڑا سا کھلایا
 تو کھولی اُن تھکی آنکھوں نے غوش
 پھرا کر اس پہ وہ نڈل ہاتھ اپنے

اُسے اہلِ تسلیم کے دکھ بتائے جنہیں سن کر کلیجہ ٹٹنے کو آئے
 گئے اُن ناشوروں کے رات بھر نام ادیبوں کے جو اکثر کھانگے دام
 بنیں گے جو کبھی دوزخ کا اندھن خرابلیس کے دانتوں کا معجن
 ادیبوں کی اسے "لسٹ" اک گھواٹی زبانی یاد جو سب اس سے کروائی
 مرا گھر مرکزِ علم و ادب تھا کہ "دنیا نے کتب" کا میں قلمب تھا
 بہت ساری کتابیں اس کو لاویں ہزاروں علم کی شمعیں جلا دیں
 تخلص اس کا رکھا میں نے جنت
 مٹی پہلی نظم اس کی "باغِ اُلفت"

حسیلینہ اور نوہینہ

اسی عالم میں گزرے نوہینہ کھلایا اک نیا گل زندگی نے
 یہ اُلفت کی کہانی رنگ لائی مرے ماحول سے وہ تنگ آئی
 میں جب کہتا کہ "تو کتنی حسین ہے" وہ کہتی "گھر میں اک پیسہ نہیں ہے"
 میں اک دن باغ سے اک پھول لایا نہ اس نے اس کو بالوں میں سجایا
 لگی کہنے "اجی اس کو ہٹاؤ" کہیں گویا کاجی اک پھول لاؤ"
 چمن کے پھول کب تک لاؤ گے تم مجھے کب تک چنے چواؤ گے تم
 بس اب اس شاعری سے باز آؤ کسی دن پیٹ بھر کھانا کھلاؤ

فراموشی کر دند عشق

گئی کھلا وہ صورت بھولی بھالی "گئی ہے بھوک" وہ اک روڑ بولی
 کہا "میں نے کہاں سے لاؤں پیسے" کہا اس نے کہ "تم عاشق ہو کیسے"
 "یہ بہتر ہے کہ وہ اب کوئی دھندا" کہا میں نے "ہٹو، شاعر ہے بندہ"
 کہا اس نے "نہ گھر کچھ کھاؤں گی میں کسی دن دیکھنا مر جاؤں گی میں
 بتاؤ پھر کرو گے پیار کس سے؟ یہ دوا نکھیں کرو گے چار کس سے؟
 بہت دن تک رہی چلتی یہ ٹکراؤ لڑے آپس میں دونوں بھوکا اور پیاسا
 سدا وہ شوخ ہاری میں نہ ہارا "ادب" تھا زندگی سے مجھ کو پیارا

وہ دشمن ہو چکی تھی اب ادب کی
 ادب کے نام تک سے جاں بلب تھی

شمع حزمیں

وہ اک دن گھر میں آہیں بھری تھی کہ مستقبل سے شاید ڈر رہی تھی
 ہوا جب ہنس کے میں کٹیائیں داخل تو اس کو دیکھ کر صدر سے گھائل
 کہا "یہ کس کا ماتم کر رہی ہو؟" یہ ٹھنڈی آہیں کیوں تم بھری ہو؟
 وہ بولی "اپنا ماتم کر رہی ہوں میں دل کو خوگر عنسہم کر رہی ہوں

نہ جانے کس جہاں میں کھو گئی میں سہاگن ہو کے بیوہ ہو گئی میں
 نہ ہے کچھ کھانے پینے کی ضرورت
 نہ ہے کچھ روتے جلینے کی ضرورت

محدوش حالات

جو دیکھے میں نے یہ مخدوش حالات دیا اس کو دلاسا حکم کر بات
 کہا اس سے کہ یوں گھبرانہ پیاری نہ دل پر ڈال غم کا بوجھ بھاری
 ہیں تھوڑے سے ابھی تکلیف کے دن یہ دولت رہ نہیں سکتی مرے بن
 یہ چیخیں مارتی آئے گی پیاری یہ آ کر ختم لے گی تیری ساری
 لگی ہے آج اگر افلاس کی چوٹ توکل تو ہی گنے کی رات دن نوٹ
 بنی بیٹھی ہے کیوں غصے سے بند تو میں بھر دوں گا ترے نوٹوں سے صندوق
 لگانے کو ہوں میں دولت کے انبا تجھے پہناؤں گا نولاکھ کا ہزار
 "رسالوں میں بہت میں آ رہا ہوں بہت مشہور ہوتا جا رہا ہوں
 جو نہی پھیلی ذرا بھی میری شہرت تو جھٹ آ جائیگی اس گھر میں دولت

ابھی تو "کورٹ شپ" کا ہے زمانہ

نہیں ہے دور "خواب اپنا" سہانا

پڑوسن کی تباہ کاری

مری کٹیپا سے تھوڑے فاصلے پر مرے اک دوست شاعر کا بھی تھا گھر
 بہ حال زار ہی رہتا تھا وہ بھی ستم افلاس کے سہتا تھا وہ بھی
 تھا اس کا نام عطاء اللہ سجاد تھا عرف اس کا تقار اللہ برباد
 مرے گھر آئی اک دن اس کی بیگم بتایا میری "اُس" کو اپنا ہر غم
 ادبوں کے جو اس نے ذکر چھپڑے مرے بچے بھی ظالم نے اڈھپڑے
 کہا اُس سے بن اب صبر کرنا یہی بہتر ہے دل پر جس پر کرنا
 الٹی توبہ! شاعر اور پیسہ؟ ہوا سے کیا کبھی دنیا میں ایسا
 یہ "چھپڑے" سدا بھوکے مرے گھر دوں میں ان کے ہم آہیں بھرینگے
 کہیں جو بھی اُسے سمجھو "تسلی" کہ جھوٹی ہے ہر اک ان کی تسلی
 بہت ہوتی رہیں آپس میں باتیں یونہی گزرے کسی دن اور راتیں

میں ان باتوں سے بالکل بے خبر تھا

ہوا اک دن وہی کچھ جس کا ڈر تھا

حسینہ اور ادیب

حسینہ موسم تھا اور رات کھٹی گلانی ہوا میں مست تھیں جیسے شرابی

کبھی ہوتا ہے یہ محسوس مجھ کو
 کسی "روس" سے ہائے میر اللہ
 "ندیم قاسمی" سو بار آیا
 میں ہو جاتی تھی شہر کے گلابی
 تم آخر کس نشے میں ہو گئے غین
 دسے میں "آگ کے دریا میں چھینکوں
 نہ یاں آئے کھنیا لال "مردہ
 جو ہنس ہنس پکڑیاں سب کی اچھلے
 نہ سمجھو شاڈ کو میں چھوڑ دوں گی
 مجھے اس تو نسوی کی فکر بھی ہے
 عدم "ملک عدم" جانا نہیں کیوں
 میں تنگ آئی تری بد عہدیوں کو
 ادب نے گر مجھے نی بی کرائی
 کنویں میں کرشن چندر کو میں چھینکوں
 زباں سے لفظ بیسی گر نکالا
 بگگائے جانے گا وہ روس تجھ کو
 نہ بنا عواد کہیں وہ تیرا پتہ
 کبھی اس نے ہن مجھ کو بسا یا؟
 وہ کیوں اسخر مجھے کہتا تھا بھابی؟
 سدا ذکر کتاب "قسطہ العین"
 "ستی" ہوتے ہوئے میں اس کو دیکھوں
 "پیدر آباد" کا مشہور گروہ
 ذرا سب اپنی ٹوپی بھی سمجھالے
 میں اس کی ملکنت بھی توڑ دوں گی
 لبوں پر تیرے اس کا ذکر بھی ہے
 یہ اب جلیتے سے باز آتا نہیں کیوں؟
 یہ آئے دن کی "باقر عہدیوں" سے
 کرے گا کیا قتیل احمد شفاقی؟
 ہے ڈوبایا نہیں اُپر سے دیکھوں
 بجا دوں گی میں فوراً تیرے بارہ

بتا مجھ کو تیرا ساحر کہاں ہے
 کہاں وہ دشمن شاہ جہاں ہے؟
 بلا دے پھاڑ دے دیوانِ خانی
 "مالِ سوزِ عشم ہائے نہانی"
 تنہا رائے کے اب تک ہر شہر تلور
 میں ڈالوں بھارت میں اس کا "نیا دور"
 یہاں "نقش" اور "نقوش" آنے نہ پائیں
 طفیل اور شاید احمد بھی نہ آئیں
 نہیں یہ شاہد احمد مجھ کو بھساتا
 جو "سید" ہو کے ٹھہری بھی ہے کمانا
 جو ہوتی کچھ شرافت اس میں باقی
 رسالے کا نہ رکھتا نام "ساقی"

ادھر آج مجھ کو سیدھی رہ پہ ڈالوں
 "خلیل الاعظمی تیسری نکالوں"

بینت گراموفون

بہت سے اور بھی لیتی گئی نام
 دیے سو سو ہر ایک شاعر کو دشنام
 ادیبوں کی بہت کی اس نے توہین
 پکڑ کر سر میں بٹھیا ہو کے غم گئیں
 بہت چچ چچ کے بعد آگیا میں
 جب اس بکواس سے تنگ آ گیا میں
 یہ پھینکا میں نے فقرہ اس پہ کس کر
 "گراموفون کی اولاد بس کر یا"
 چمک کر بول اٹھی وہ ماہ سپارہ
 "کہا کیا ہے؟ ذرا کہنا دوبارہ"
 میں بولا بہت برقی زیادہ ہے تو
 گراموفون کی اولاد ہے تو
 بچی ہے گر تو بچتی ہی رہے گی؟
 جو گر جی ہے گر بچتی ہی رہے گی؟

راجہ مہدی علی خاں کی شاعری

جو دیکھا میرا اندازِ زباں اور
زباں میرے لیے بھی اُس نے کھولی
”تو شاعر ہے یا اب تو بھی ہے شاعر
تری نظیں ہیں کیا پھرے کا ہیں ڈھیر
ان ہیں کچھ ”اُلٹ“ ہے اور نہ کچھ پھیر
ان میں ”سرگانی“ اور نہ ”ابہام“
”غریبی“ ہے نہ ہے ”مزدور“ ان میں
کبھی لکھا کسی نے تجھ پر منہوں
بہت سوں کو بنایا اُس نے اُو
جو گلن ہو تو اُس میں ڈوب مرنا
مگر یہ شاعری مُڑ کر نہ کرنا

دیارِ شعر کے ادنیٰ اسے سزا ہوا

وزیرِ آغا تجھ کو دے گا برباد

کچھ وزیرِ آغا کے ہاں ہے

میں اب تک اُس کے سب باتیں تھا خاموش جو ”ذکرِ یار“ آیا آگے جوش

کہا میں نے یہ بصر کر آہ ٹھنڈی
وہ دنیا کے شرافت کا خدا ہے
وہ چاہے تو تجھے کر دے ابھی ٹھیک
اُسے مت فیض احمد فیض سمجھو
اُسے ”چودہ حواسوں“ پر ہے قابو
وہ بیٹھا ہے وہاں خاموش چپ چاپ
جگہ سے اپنی وہ ہلتا نہیں ہے
برس میں اک دھند وہ بولتا ہے
کہوں کیا میں ”جلالی“ پیر ہے وہ
بر شیر اُس کی جب تکتے ہیں ہیئت
نہ شیطان ڈر کے اس کے پاس جائے
یہ ظاہر ہے وہ عجیب اور بے جاں
سمندر دیکھ کر اس کو سمٹ جائیں
کبھی چنچے تو سو طوفان آ جائیں
”بڑے دھانگے“ میں تاروں کو پرو کر

وزیرِ آغا کی مت کر بات رنڈی
سمجھ مت یہ کہ وہ مجھ سے جدا ہے
اسکو سبوں تری شہ رگ کے نزدیک
غضب سمجھو اُسے یا غیظ سمجھو
ہے سرگودھے کے جنگل میں وہ سادھو
اُسے ”ڈرٹرب“ کرنا ہے ہاں پاپ
کسی ذی رُوح سے ملتا نہیں ہے
بڑی مشکل سے وہ لب کھولتا ہے
تیرے تیرے، شمشیر ہے وہ
تو کر جاتے ہیں جھٹ ہاتھوں پہنیت
اگر اُسے دعا نہیں پڑھ کے اُسے
یہ باطن ہے وہ اک خاموش طوفان
ہو انہیں ڈر کے پیروں سے چٹ جائیں
اندھیرے چاند اور سورج پہ چھا جائیں
”بڑے دھانگے“ میں تاروں کو پرو کر

بنا لیتا ہے اک تسیج شب کو عجب کچھ جنبشیں دیتا ہے لب کو
 کوئی لمبی دعا وہ مانگتا ہے خدا سے جلنے کیا وہ مانگتا ہے
 تو ڈر مجھ سے کہ ہے وہ پیر میرا وہی خنجر ہے میرا تیر میرا
 نظر ڈالے جو تجھ پر خاک کر دے
 ترا اک پل میں قصہ پاک کر دے

معمر کہ کفر و اسلام

وہ بولی وہ اگر ہے دوست تیرا عقیدہ اٹھ گیا اس پر سے میرا
 وزیر آغا اگر ایسا ہی ہوتا تو پھر وہ دوست کیا تیرا ہی ہوتا
 میں بولا پیر کو تکلیف کیوں دوں تیرے لٹے میں خود ہی کیوں نہ لے لوں آ
 یہ کہہ کر ٹھہر جا لو کی پھٹیا اٹھالی میں نے ہاشم خاں کی لٹھیا
 جھپٹ کر اس نے یہ لٹھیا گرا دی پلٹ کر لات اک میں نے جمادی
 لپک کر اُس نے چھوڑے مجھ پہ مکتے ادھر سے بھی چلے کچھ تیرے مکتے
 فرانی پین لے وہ مجھ پہ دوڑی چمک کر تمام لی میں نے ہتھوڑی
 مرے سینے پہ پھینکا اس نے حقہ "بزن" کہہ کر دیا اک میں نے مکہ
 ادھر سے آیا اک بطح کا انڈا ادھر سے بھی "کسٹالی" اور ڈڈا

ادھر سے "کس" کے پھینکے اُس نے آلو کیے بندے نے بھی "عاصر" کچالو
 مروڑی اس پر ی نے میری انگلی
 تو پیروں پر شکا دی میں نے "ممنگلی"

خوں ریز جنگ

بس اب دونوں نے رکھ دی طاق میں شرم ہوئے ہم دونوں آہن کی طرح گرم
 جنوں ایسا اٹھا دونوں کے سر میں غضب کارن بڑا چھوٹے سے گھر میں
 بڑی مٹہ زور ہاتھ پائیاں تھیں بڑی خوں ریز جنگ آرائیاں تھیں
 ادھر پائل بجی چم چم چم چم ادھر مکتے چلے دھم دھم دھم دھم
 مرا مٹہ آگے بڑھ کے اُس نے نوچا ادھر سے ٹیٹو میں نے دبوچا
 جو میں نے ہاتھ زلفوں پر بڑھایا تو اس نے ہاتھ میرا کاٹ کھایا
 چلی لٹھیا کھٹا کھٹ کھٹ کھٹا کھٹ گے آنسو پٹ پٹ پٹ پٹا پٹ
 چھین زلفیں فٹ فٹ فٹ فٹا فٹا بڑے تھڑ پٹا پٹا پٹا پٹا پٹا پٹا پٹا

اب ممنگلی پنجابی میں حمام دستے کو کہتے ہیں جس سے سالہ وغیرہ کوٹا جاتا ہے۔

قیامت کی ہوئی وہ "نارا ماری" گیا تمہرا اور اس کی ساری
 اگرچہ اس کی پچھیں عرش پر تھیں مگر سب چوڑیاں اب نرش پر تھیں
 کبھی جو گال تھے ہلکے گلابی ہوئے اب تھپڑوں سے وہ عنابی
 جب اُس کو مقام کر چٹیا گھمایا بہت ہی اُس نے واویلا چھایا

چھٹیں اس لیے پھل پھریاں وہ پیاری
 کہ سکتے ہو گی شاعر پہ طاری

بہشت آنجا

حیاناؤں نے جھانکا بام و در سے نہ باہر آسکیں وہ میرے ڈر سے
 مگر سن کر مسلسل ہاتے ہائے پڑوسی جب وہاں گھبرا کے آئے
 کہا میں نے کہ بھاگو اور دوانو نہ کو دو آگ میں اسے ہر بانو
 یہ کیوں تکلیف تم کرتے موزنہار! نہیں جھگڑا یہ ہم دونوں کا ہے پیار
 پڑوسی تم ہو میرے لنگھ مجھے دو چلے جاؤ نہ آکر دکھ مجھے دو
 یہ کدو جیسے سر میں پیوڑوں گا یہ سارے جیسی ٹانگیں توڑ دوں گا
 کروں کر اپنی میرے گھر نہ آؤ بہشت اپنے محلے کو بناؤ

"بہشت آنجا کہ آزارے نہ باشد کسے را با کسے کارے نہ باشد"
 مجھے دیکھا آنکھوں نے مسکرا کر
 مٹا پھر چلے دیے گردن جھکا کر

چار رکعت نماز فرض

اب اُس کا سر کو اٹھا یاد آیا مصللاً اُس نے رو رو کر بچھایا
 اگرچہ تھی تپش اُس دن بلا کی "نماز دوپہر" اُس نے ادا کی
 اٹھائے پھر دعا کو مر مر یہ ہاتھ بڑے ہی درد و کرب و رنج کے ساتھ
 مری سب یاد کر کے جھنپیں یہ مانگیں اُس نے رو رو کر دعائیں
 "دعا یہ ہے اُسٹھے ہیں مجھ پہ جو ہاتھ ہنڈوڑے سے اُنھیں توڑے جگن ناتھ
 دعا یہ ہے مری اسے ذات باری چھا ڈالے اسے فارغ بخساری
 دعا یہ ہے مری اسے میرے مانگ اسے لے جائے علم الدین ساکت
 دعا یہ مانگتی ہے تجھ سے بندی کہ لے بھالسنہ اسے انور کہ بندی
 دعا یہ ہے کرے سنہ اس کا کالا وہی شہ نامہ اسلام والا

لے جگن ناتھ آزاد لے ابوالاثر حقیقہ جاننا بہری

مجید امجد کا کتا اس کو کاٹے یہ رو رو کر کے پنجے اُس کے چھاٹے
 اسے یوسف ظفر رستے میں پیٹے اسے عابد غسلی عابد گھیٹے
 اثر صہبائی بھی آجائے جھٹ سے ٹکائے ایک مگنا اس کو کھٹ سے
 بُت گل نام راد شتام گفنی " یہ کہہ کر بیٹے کے ممتاز مضمی
 دعا ہے اُنک کے گھر جب بھی جائے وہاں وہ ہنار دُوں سے اس کو پڑائے
 سمت پرکاش اسے ہنر و بنا لے بنارس جا کے یہ پٹیا بڑھالے
 اسے پھینکے برائے " نیاک نامی " قلب مینار سے خوش تر گرامی
 بنے یہ کو چوال ہانگے یہ ٹانگے رشی پٹیا لوی سے بھیک مانگے
 نہ اس کو ظاہر مٹھی ہی چاہے وہ آکر پیٹ جائے گا ہے گا ہے
 پڑھ لیں جو شش و عرش مسیانی کہیں بناری پہ اتنی مسربانی
 وہ آئیں بن کے ڈاکو منہ پیٹے اسے کھا جائیں دونوں باپ پیٹے
 بلا سے گر وہ ویجی ٹیسرین ہیں جھینقت ہے کہ دونوں ایرین ہیں
 دعا ہے اب اسے جلدی کروت آئے اسے پطرس بخاری آکے لے جائے
 نہ بہر تعزیت ہی کوئی آئے پنازہ اس کا خود شیطان اٹھائے

یہ کتاب ہے مرا ہر نہ خیم تازہ ہوں کتے ساتھ جب نکلے جنازہ
 کرے شیطان ہی تہمینز و تکفین
 پکارو اسے فرشتہ ابل کے آمین

میری مختصر سی دعا

اٹھی جب وہ مصالے پر میں آیا خدا کے سامنے سر کو جھکایا
 دعا کو موٹے موٹے ہاتھ اٹھائے نہیں پر ایک دو آنسو گراٹے
 کہا مالک سے اے دُنیا کے والی ترے در پر کھڑا ہے ایک سوالی
 ترا در بار ہے در بار عالی بھگا دینا نہ مجھ کو دے کے کالی
 یہ تیری ہی شریعت میں لکھا ہے کسی کو گالیاں دینا بُرا ہے
 میں ٹوٹے دل کا اکتارہ بجا کر تری رحمت کی گنڈی کھٹ کھٹا کر
 نہ جنت مانگتا ہوں اور نہ حوریں نہ کتا ہوں کہ دے عربی کھوریں
 نہ سونا اور نہ چاندی مانگتا ہوں میں تجھ سے انتخاب یہ کر رہا ہوں
 کہ جو بندی ترے در پر کھڑی تھی جو اپنی ناروا ضد پر اڑی تھی
 ابھی مانگی ہیں جس نے سو دعائیں سنائی ہیں تجھے جھوٹی صدائیں

تو اُس بندی کو اب ڈیکھت کر دے
 دعائیں اُس کی سب ریکھت کر دے

بہارِ آخر شد

وہ رشکِ ماہِ آنگن میں کھڑی تھی رواں آنکھوں سے آنکھوں کی جھڑی تھی
 وہ مال اُس کو دیا اک میں نے لا کر دیا پھینک اُس نے جو غصے میں آ کر
 یکا یک ہو گئی چپ روتے روتے کہ جیسے چونک اٹھی ہو سوتے سوتے
 سب آنسو آستیں سے پونچھ ڈالے جو باقی تھے وہ آنکھوں میں سنبھالے
 دیے پانی کے چھینٹے مُنہ پہ دوچار کیے خشک اپنے بھگے بھگے رخسار
 لیے ہاتھوں میں کاجل اور سلاخی وہ پیش آئینہ اٹھلا کے آئی
 دیے آنکھوں میں جیہ کاجل کے دھاسے چمک اُٹھے اُن آنکھوں کے ستارے
 لگائے مُنہ پہ پت پوڈر کے دوچار لپ اٹک سے بنایا لب کو گلزار
 سیہ زلفوں کی بدلی کو سنوارا دماک اٹھی وہ پھر سے ماہ پارا
 وہ اک زخمی پری بن کے اٹھی تھی قیامت سما منے میرے کھڑی تھی
 ہزاروں بجلیاں برسار ہی تھی مگنا ہوں کو مری تڑپا رہی تھی
 یہ جی چاہا کہ سینے سے رگالوں اسے پھر دل کی دھڑکن میں بنا لوں
 مری نیت کو اک دم پا گئی وہ مرے نزدیک ہنس کر آ گئی وہ
 یکا یک عشق سے بے تاب ہو کر گری جھٹ سے مرے قدموں پہ دو کر

یہ بولی رجم کیجے مجھ پہ سرکار جہاں تانی، نہیں تانی مرا پیار
 میں اُجھی آپ سے بس ہو گئی بھول ہوا جو کچھ بھی اس پر ڈالیے دھول
 نہ چاہوں آپ کو کیا ویشیا ہوں؟ زین ہندی ہوں، فخر ایشیا ہوں
 ملا لیجے مگنا ہیں مسکرا کر بنا لیجے مجھے اپنا امٹھا کر!
 نشے میں جیت کے میں مسکرایا اُسے قدموں سے اپنے جھٹ اٹھایا
 وہ بولی "دیکھیے کیسے پہ بلبل کہاں سے آ گئی ہے یہ بنا گل؟
 جو بلبل دیکھنے کو سر گھمایا میں چیخا "مر گیا ہے میں خدایا"

مرے معصوم سر پر ایک ڈنڈا

لگا یوں تھا، کہ میں اک دم تھا ٹھنڈا

اخیری منظر

وہ بھاگی جھٹ سے اب گٹیا سواہر نکا دتہ سرد والی اک پلٹ کر
 لگی کہنے کہ "بس اب تجھ پہ لعنت گئی پوٹھے میں سب تیری صحبت"
 یہ سن لے میں تجھے ٹھسکا رہی ہوں میں دولت خاں کے گھرا بجا رہی ہوں
 تو اس کوٹیا میں بیٹھا شاعری کر میں جلیے جا رہی ہوں، تو ہیں مر
 میں بولا "چاہے ناتے توڑتی جا یہ سر ٹوٹا ہوا تو جوڑتی جا

تو روئے جا رہی ہے اپنے دکھڑے نہ جانتے ہو گی یہ کتے "کھڑے"
 وہ کہہ کہہ "چیر لو" مجھ سے یہ بولی "ترے پاس اب مری آتی ہے جوتی
 پیٹھ تکہ پیر وہ غصے سے چل دی میں پیلا پڑ گیا جیسے کہ صدی
 کہ اسجدے میں اور بولا خرابا "یہ کیسا دن مجھے تو نے دکھایا؟
 "زن خود رفتہ" باز آید کہ ناید بعد عجز و نیاز آید کہ ناید

زنان بے شمار اندر جان اند

"زن بندہ نواز" آید کہ ناید

زند کے زند رہے

خانہ بہ مہمان گذاشت

گھر میں آیا ہے جو مہمان نہیں جائے گا
 لے کے جائے گا بری جان نہیں جائے گا
 رہ پڑا ہے یہ مرے گھر میں ہمیشہ کے لیے
 جب تلک جسم میں ہے جان نہیں جائے گا
 گالیاں دل میں ہزاروں اسے دی ہیں لیکن
 اس کو ہوتا نہیں عرفان نہیں جائے گا
 میں وہ یعقوب ہوں جو اس سے بچھڑتا چاہے
 یہ وہ یوسف ہے جو کنعاں نہیں جائے گا

وانے وانے پہ خدا نے ہے لکھا اس کا نام
 گھر میں جب تک ہے یہ سامان نہیں جائے گا
 ہم کہتے ہیں تو یہ کیوں ہے کہینہ یارب؟
 اب تو یہ تا حد امکان نہیں جائے گا
 اس کے والد کا یہ گھر ہے نہیں رو جان بہار
 یہ رہے گا علی الاعلان نہیں جائے گا
 پاؤں نازک ہیں ترے ان کو نہ غصے میں چک
 یہ بت بے حس و بے جان نہیں جائے گا
 اس پہ آئے ہوئے غصے کو نہ بچوں پہ نکال
 پٹ کے ہو جائیں گے ہلکان نہیں جائے گا
 "ہیت انگریزی" نہ پڑھا اس پہ نہ "لا حول" ہی پھونک
 اس کا اللہ ہے نگہبان نہیں جائے گا
 آ جا رو رو کے گلے اس کے ملیں ہم دونوں
 میرا ذمہ تیرا ایمان نہیں جائے گا

کئی بار اس نے کنکھیوں سے تجھے دیکھا ہے

دل میں لے کر ترے ارمان نہیں جائے گا

اے مری سرو خرا ماں اے مری حورِ جمال

تیری جنت سے یہ غلمان نہیں جائے گا

ہائے بے چارے کو تو کتنی پسند آئی ہے

اب تو دیدیگا یہیں جان نہیں جائے گا

دینے والا ہے یہ شاید تجھے شادی کا پیام

ترے ور سے کسی عنوان نہیں جائے گا

سنگدل پیٹ نہ یوں مجھ کو میں سچ کہتا ہوں

گھر چلا جائے گا "دریان" نہیں جائے گا

نو کروں سے ابھی بندھواتا ہوں سامان ترا

یہ یونہی بے سرو سامان نہیں جائے گا

میں ہی چل دیتا ہوں گھر سے اسے تکلیف نہ ہو

چھوڑ کر یہ ترا "دامان" نہیں جائے گا

ذوالخالد و عرفان چلا جائے گا

"وارث خالد و عرفان" نہیں جائے گا

رو نہیں جان ادا ہونٹوں پہ لے آسکان

میں بھی اس گھر میں کبھی آؤں گا بکر مہمان

دل پر میں جبر کیے صبر کیے بلینٹا ہوں
 لے کے میں بھوک کا طوفان نہیں جاؤں گا
 خشمگین نظروں سے آخر مرا کیا بگڑے گا
 تم کو ہو جائے گا خفقاں نہیں جاؤں گا
 کھا رہا ہوں میں تنگا ہوں کے ہزاروں دھکے
 پھر بھی ہونٹوں پہ ہے مسکان نہیں جاؤں گا
 کیوں پکائی ہیں یہ سب چیزیں مزیدار لذیذ
 میرا ہر چیز میں ہے دھیان نہیں جاؤں گا
 مجھ کو معلوم نہ تھا اتنے کمینے ہو تم
 جاؤ جاؤ علی الاعلان نہیں جاؤں گا
 اتنا کھاؤں گا کہ آجائے گا غش تم سب کو
 تم کو کر دوں گا میں ہلکان نہیں جاؤں گا
 اے رذیلو! مجھے جانے کے اشارے نہ کرو
 جب تلک جسم میں ہے جان نہیں جاؤں گا

ایک اور مہمان

بن کے آیا ہوں میں مہمان نہیں جاؤں گا
 سب کو کر دوں گا پریشاں نہیں جاؤں گا
 بیٹھ کر چین سے پھونکوں گا تہا کے سگریٹ
 پاک رہے ہیں ابھی پکو ان نہیں جاؤں گا
 فوج ہوتی ہوئی مرغی کی صدا آتی ہے
 گھر میں دعوت کا ہے سامان نہیں جاؤں گا
 دوں گا میں مسجد مہمان نوازی میں اذال
 میں ہوں اک سچا مسلمان نہیں جاؤں گا

پونچھ لو آنکھوں میں آتے ہوئے ہر آنسو کو

میں تو اب تا حد امکان نہیں جاؤں گا

خود ہی کہہ دو کہ "اجی چائیے کھانا کھا کے"

ورنہ میں خود ہی مری جان نہیں جاؤں گا

"مدعی لاکھ بڑا چاہے تو کیا ہوتا ہے

وہی ہوتا ہے جو منظور خدا ہوتا ہے"

راجندر پیری اور چولہ

(۱)

رات تاریک ہے اور دیراں سڑک
اجنبی کس لیے تم یہاں ہو کھڑے؟
پھر کھڑے اس طرح ہو کہ ہر اک نظر
بے شبہ تم پر مشکوک ہو کر پڑے
بال بکھرے ہوئے ہیں نکلا ہیں حوزیں
سیح بناؤ مجھے کیوں پریشان ہو؟
اپنے تھوڑے سے غم دوست بچھو کو بھی
مجھ سے تم کچھ چھپاتے مری جان ہو

(۲)

میں نے سن لی ہے سب داستان الم
ان ستاروں کی چھاؤں میں دل تھام کر
قصہ مختصر یہ کہ تم چور ہو
اس مکان پر ہے شاید تمہاری نظر

اس مکان کے بکس سے کئی سال سو
 جب یہ مفلس تھا کتنی تھی دنیا سمی
 دولت آتے ہی سب سے اڑنے لگا
 لوٹ کر اس کا گھر اس کا مال اس کا دھن
 کہہ کے بسم اللہ اب ساتھ آؤ میرے
 جو بھی چاہو گے اس گھر سے مل جائے گا
 کھل گیا ایک جھٹکے میں ٹیڑو ذرا
 چچے چچے سے اس گھر کے واقف ہوئیں
 اندر آ جاؤ چکے سے اے اجنبی
 "صاحب خانہ جانے کدھر مر گیا
 مقوڑی تھوڑی مری جان پہچان ہے
 اے خدا کتنا اچھا یہ انسان ہے
 پھر گئے اس کے دن بڑھ گئی اس کی "میں"
 خاک میں ہم ملا دیں گے آج اس کی "میں"
 توڑ دیں اس علی گڑھ کے تالے کو ہم
 ہے یقین مجھ کو اس کا خدا کی قسم
 ایک طے میں بجلی جلاتا ہوں میں
 "مال اصلی نہاں ہے؛ بتاتا ہوں میں"
 ہاں میں ہر طرف روشنی ہو گئی
 آج نقدیر کم بخت کی سو گئی

(۱۲)

بھوک تم کو لگی ہے تو آؤ ادھر
 دیکھو گھبراؤ منت خوب کھاؤ پیو
 "صاحب خانہ" کی میز پر آم ہیں
 کبیر کی ڈش ہے یہ ساتھ چچے نہیں
 بسکٹوں کا یہ ڈبا ہے یہ جام ہے
 آج کی رات اس گھر کا نیلام ہے
 یہ پھری بھی ہے کھاؤ انہیں کاٹ کر
 صاف کر دو زباں سے اسے چاٹ کر

بس میاں کھا چکے؛ اچھا اچھا چلو
 لے میں اس گھر کی اب ہم تلامشی ذرا
 سارے کمروں میں چاروں طرف گھوم کر
 آج کم کر لیں فکر معاشی ذرا
 (۵)

لے لوئے کوچی پچیس سو نفٹ ہیں
 اس کی بیوی نے شاید چھاپے تھے یہ
 اس کی جیبوں سے وقتاً فوقتاً کبھی
 اس بچاری نے شاید اڑائے تھے یہ
 گیارہ تو لے گا ہے غالباً بار یہ
 تین تو لے کی شاید ہیں یہ یا لیاں
 کھو لو الماریاں مجھ کو معدوم ہے
 ان میں پانڈی کی ہیں نو عدد تھایاں
 یہ ذمہ کے جھکے، یہ ہیرے کے سیٹ
 ننھی ننھی یہ سونے کی انہیں بھی ہیں
 پھر نہ باقی رہے گی بجالے کی "میں"
 جب انہیں جیب میں رکھ کے چل ڈگے تم
 گرم یہ سوٹ ہاں ہاں چرا لو انہیں
 سر دیوں میں تھامے یہ کام آئیں گے
 جسم پر گرتا مارے نہ یہ فٹ ہوئے
 اچھی قیمت پر بیشک یہ باک جاؤں گے
 کسی ایران کے بانگ ہی کی طرح
 کس قدر خوبصورت یہ قالین ہے
 کر کے تہہ اس کو پوری ہیں رکھ لو ذرا
 نہ چرمانا سے اس کی تو این ہے

(۶)

بھر چکی ہیں "اناٹ" یہ سب بوریاں
 کیا یہ چاروں کی چاروں اٹھا لگے تم؟

اتنا ہی خوش کرو گے مجھے آج تم
 اور کچھ چاہیے؟ اچھا اب جاؤ گے؟
 میں تمہیں چھوڑاؤں گا کچھ دور تک
 مجھ کو حصہ نہ دو بھاگ جاؤ بس اب
 ہو سکے گرتا بجاتے جاتے ذرا
 نہیں جذبات کی رو میں اتنا ہو
 تم کو کافی ہے جو کچھ تمہیں مل گیا
 رات تاریک تھی اور ویراں سڑک
 تاروں کی چھاؤں میں دیر تک میرا دل
 کامیابی پر اپنی بہت خوش تھا "وہ"
 مجھ سے اٹھو ا کے جو اس نے سر پر رکھا
 سب کا سب میرے ہی گھر کا سامان تھا
 اس حقیقت سے بے چارہ انجان تھا
 میرے سینے میں دھک دھک دھڑکتا رہا
 میں کھڑا دیر تک اس کو نکلتا رہا
 فکر میری کرو تم نے اسے مہرباں
 مجھ کو کافی ہے جو کچھ ہے باقی یہاں
 دیکھ لے گا کوئی اور ہی ہے سحر
 مسکرا کر مجھے دیکھ لیا اک نظر
 تم ہو محفوظ اسے دوست رکھو یقیناً
 حشر نہیں جتنی دل کی نکالو گے تم

حساب دشمنانِ دل

(۱)

"سلا ماں لیکم! قسم خدا کی بہت ہی عمر آپ کی بڑی ہے"
 (صبح صبح توبہ توبہ توبہ نگاہ کس شوم سے لڑی ہے)
 دیکھتی ہیں کیوں آپ بہ بیٹھے ناگے ہیں تیار وہ ڈانٹتے
 (نہیں وہ گھر میں تو اب کرے گی تو جلد جانے کے سو بہانے)
 "غضب کا حسن آج آپ پر ہے بھروسے میں کیا چند آہیں ٹھنڈی"
 (رنگا کے دنبالہ دار کا جل تو ہو ہو لگ رہی ہے رنڈی)
 "پتلیں گی کیا آپ روح افزا نہیں! تو پھر کیا پیش کی جائے؟"
 (ترے خنم کا یہ گھر ہے شاید کہ جب بھی جی چاہا کھٹے رہے)

"زبیدہ جلدی سے چائے لاؤ، یہ دیکھو تشریف لائیں آپا"
 "تمہاری باجی کی سوت آئی ہے اس کا اگر کروسیا پا
 "مشین کیا چیز؟ میں تو حاضر کروں اگر آپ جاں بھی مانگیں
 "مشین کیا تیرے باپ کی ہے؟ میں پیردوں تیری دوزن مانگیں
 "وہ چھ بچے شام کل ملیں گے! جی چھ بچے آپ آسکیں گی
 "دو پٹہ سرکا کے کل ہی آپ ان کو اپنے نخرے دکھا سکیں گی
 "سور کی بچی! حرام زادی! چھنال! "جی کون؟ بی رضیہ!
 "قسم خدا کی میں ایک دن تنگ آکے نمٹوں گی سب قضیہ
 "مگر رضیہ تو نام میرا نہیں جی وہ ایک دوسری ہے
 "رہبت دنوں سے چھنال میرے میاں کے پیچھے پڑی ہوتی ہوا
 "زبیدہ تو بہ کہاں گئیں پھر، ذرا مری جان ادھر تو آنا
 "رضیہ آپا کو اپنے پیا تو پہ ان کر وہ غزل سنانا
 "زمانہ آیا ہے بے ججانی کا عام دیدار یار ہوگا!
 "کنوار یوں کا بیا ہتا مردوں کے ساتھ چپ چپ کے پیار ہوگا

زندگی کے زندہ ہے

اے خدا! آج تجھ سے جو کتا ہوں میں اس کا مطلب میں بالکل نہیں جانتا
 مجھ کو آئی نہیں ہے تری یہ بیاں اپنا یہ عجز میں کب نہیں جانتا
 جلدی جلدی دھوکے کے آیا ہوں میں سر پہ ٹوپی ہے اور ہاتھ بیٹنے پہ ہیں
 اور خیالات کے طائر خفتہ پر محو پرواز کتے مدینے پہ ہیں
 اچھی اچھی ہی بانیں یہ ہوں گی کوئی گو سمجھ میں مری کچھ بھی آیا نہیں
 قوم نے آیتیں تو سکھا دیں مگر ان کا مطلب کسی نے بتایا نہیں
 خالق دو جہاں! معذرت میری کتا! اس لیے پڑھ رہا ہوں نماز قضا
 رات کو دیر سے مجھ کو چھٹی ملی نصف شب سے نہ پہلے میں گھر آسکا

صبح آئی تھی بیوی جگانے مجھے پدم سے مجھ پہ کچھ رحم سا آ گیا
 بخش دیتا اسے وہ بڑی نیک ہے اس بچاری کو شیطان بہکا گیا
 دیکھ پھر میں نے اللہ اکبر کہا ہاتھ گھٹنوں پہ رکھتے ہی سر جھک گیا
 جب کہا میری بیوی نے "جلدی پڑھو" تو خیالات کا سلسلہ رک گیا
 وہ بھی سچی ہے اے رازق دو جہاں! اس کو ڈر ہے کہ میں لیٹ ہو جاؤں گا
 نوکری لیٹ ہونے سے گر چھٹ گئی پھر غویبی کی نکروں میں کھو جاؤں گا
 مرد پڑ جائے گا پھر سے چو لہا مرا میرے مہصوم سب بھوکوں مر جائیں گے
 تو نے تھوڑا سا بھی گر تغافل کیا رازق دو جہاں وہ کہہ جا میں گے
 ان کے آگے بھی سر کو جھکاتا ہوں میں تیری دنیا میں ہیں اور یہی کچھ خدا
 اے خدا رحم کر تو مرے حال پر میں نہ ان سے جدا اور نہ تجھ سے جدا

This book has been
ended here

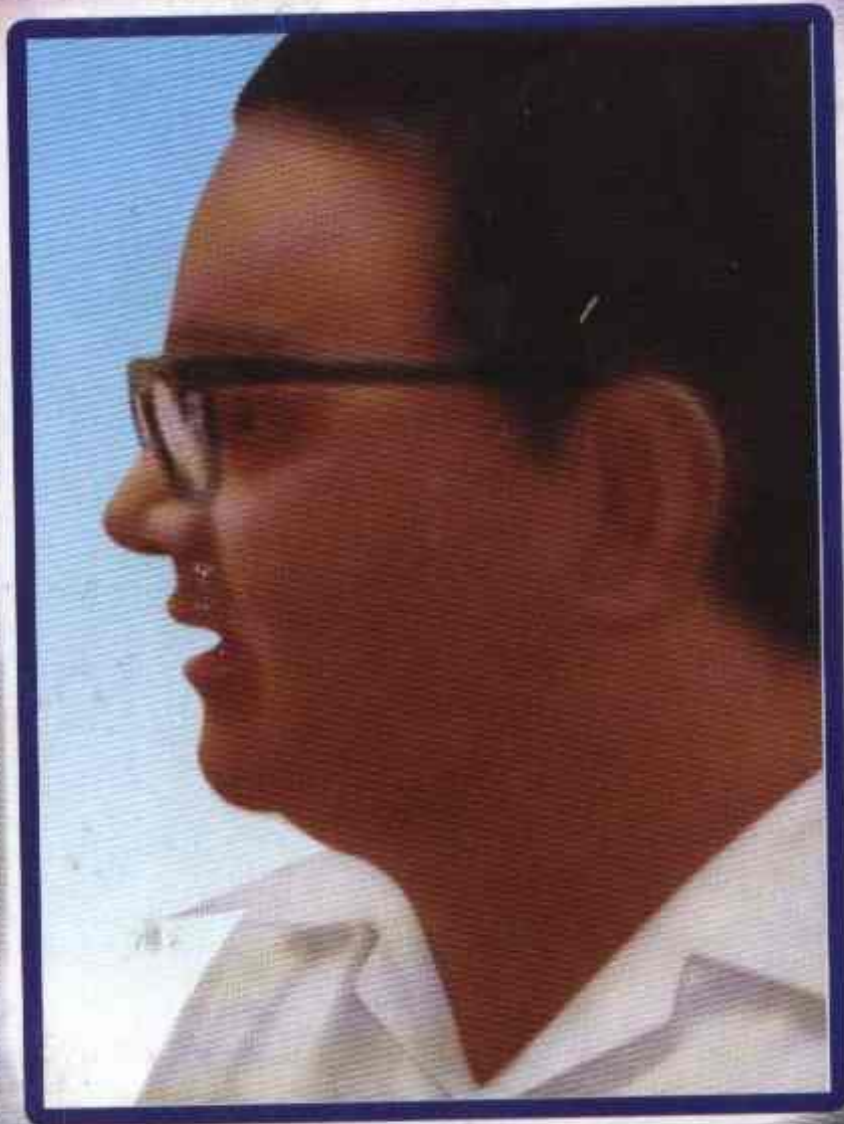
خط لکھیں گے

گرچہ مطلب.....!!

(راجہ مہدی علی خاں کے خطوط کا مجموعہ)

ڈاکٹر عبدالقادر مقدر

راجہ مہدی علی خان
کی
ادبی خدمات



ڈاکٹر عبدالقادر مقدر

Abdul Qadeer
Muqadar,
Dakkan

کچھ راجہ مہدی علی خاں کے بارے میں

۲۳ ستمبر ۱۹۱۵ء کو راجہ مہدی علی خاں وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ (پنجاب) پاکستان میں پیدا ہوئے۔ ان کی بیگم طاہرہ سلطانہ محنتی کے بیان کے مطابق وہ اپنے آبائی گاؤں کرم آباد میں پیدا ہوئے جہاں ان کے نانا کرم الہی بہت بڑے جاگیردار تھے۔ اور انہی کے نام سے یہ گاؤں ”کرم آباد“ موسوم ہے۔ زرخیز کمارشاد کو دیئے گئے ایک انٹرویو میں راجہ مہدی علی خاں نے اپنے لڑکپن کی شرارتوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا۔

”مشن اسکول وزیر آباد ضلع گوجرانوالہ کے ماسٹروں سے پٹ پٹا کر اور پونے دو میل پیدل چل کر اپنے گاؤں میں واپس آرہے تھے کہ گاؤں کی قریبی سڑک پر میری پھوپھی زاوہن دوڑتی دوڑتی ہانپتی کانپتی آئی اور کہنے لگی۔ آج آپ لوگوں کی خیر نہیں، دونوں ماموں جان چھڑیاں لے کر آپ کے خیر مقدم کے لئے تیار بیٹھے ہیں۔“

راجہ مہدی علی خاں کا تعلق علمی گھرانے سے تھا۔ آپ کے والد عنایت اللہ خاں نہ صرف شعر فہم تھے بلکہ خود بھی شعر کہتے تھے۔ والدہ حبیبہ خانم بہت ہی مقبول صاحب دیوان شاعر تھیں۔ ان کا قلمی نام ح۔ ب صاحبہ تھا۔ علامہ اقبال نے ان کے بارے میں کہا تھا کہ ”مشرقی خواتین میں یہ ایک مقبول شاعرہ ہے۔“ ”نوائے حرم“ ان کا مجموعہ کلام کافی مشہور ہوا۔ ان کے چار بھائی اور ایک بہن، ز۔ ب۔ صاحبہ مشہور افسانہ نگار تھیں۔ اس طرح راجہ مہدی علی خاں کے ایک ماموں مولانا ظفر علی خاں شعلہ بیاں خطیب، بلند پایہ شاعر اور ایک اعلیٰ درجہ کے مسلمہ ادیب و مترجم تھے۔ وہ ایک سیاستداں اور مجاہد آزادی تھے۔ لاہور اور پنجاب بلکہ پورے ملک میں مدت تک ان کا طوطی بولتا رہا۔ روزنامہ ”زمیندار“ کے ایڈیٹر اور طنز و مزاح کے نامور ادیب شاعر تھے۔ وہ نہایت ہی بے باکی کیساتھ انگریزی حکومت پر طنز کیا کرتے تھے۔ جس کے نتیجے میں متعدد بار قید و بند کے مصائب بھی جھیلے، اخبار کی ضمانتیں بھی ضبط ہوئیں۔ زمیندار کے علاوہ وہ دکن ریویو اور ستارہ صبح کے بھی ایڈیٹر تھے۔ ۱۸۷۳ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۵۶ء میں اپنے گاؤں کرم آباد میں انتقال کر گئے۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن ڈی۔ لٹ کے ایک خط میں راجہ صاحب لکھتے ہیں:-

”مولانا ظفر علی خاں مرحوم ایڈیٹر اور مالک اخبار

”زمیندار“ لاہور، حامد علی خاں سابق ایڈیٹر ”ہمایوں“

لاہور، حمید احمد خاں صاحب پرنسپل اسلامیہ کالج لاہور

تینوں میرے ماموں ہیں جنہیں انداز بیاں اور ”کے ریویو

کے سلسلہ میں“ ”نصرت“ (ماہنامہ پاکستان) والوں نے میرا بھائی لکھا ہے۔ حمید احمد خاں پندرہ سال سے غالب پر ایک کتاب لکھ رہے ہیں جو شاید اب تک پوری نہیں ہوئی۔ محترمہ ح۔ ب صاحبہ میری والدہ ہے۔ (والد صاحب دو برس ہوئے پاکستان میں انتقال کر گئے) ان کی نظموں کا مجموعہ ”نوائے حرم“ شائع ہو چکا ہے۔ دس پندرہ برس سے کہنا اور لکھنا بند کر دیا ہے۔ ڈاکٹر اقبال مرحوم ان کی شاعری کے بہت ثنا خواں تھے۔ محترمہ ز۔ ب صاحبہ کے افسانوں نے آج سے بیس پچیس سال پہلے دنیائے ادب میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ وہ میری خالہ ہیں۔ اور پاکستان میں ہیں۔ جب میں ”پھول“ اور ”تہذیب نسواں“ ایڈٹ کرتا تھا۔ اس وقت میری عمر شاید بیس برس ہوگی۔“

راجہ مہدی علی خاں کے ایک بھائی اور چار بہنیں تھیں۔ راجہ صاحب کے چھوٹے بھائی عثمان علی خاں پہلے ریلوے میں ملازم تھے پھر انہوں نے اپنی ملازمت ترک کر کے ”مخزن“ جاری کیا جو اپنے وقت کا مقبول پڑچہ تھا۔ راجہ صاحب کی بڑی بہن عذرا خانم بھی شعر کہتی تھیں ان کے شوہر ایک کامیاب بزنسمن تھے۔ سلمیٰ خانم خالدہ خانم اور زبیدہ خانم جو

عثمان علی خاں کے بعد پیدا ہوئیں۔ سبھی کو علمی شغف تھا اور سبھی شعر فہم اور شاعر تھیں۔ اس طرح راجہ صاحب کا تہیال اور داد پہال دونوں گھرانے تعلیم یافتہ علم و ادب کے رسیا تھے۔ جس میں راجہ کی پرورش ہوئی۔ خود ان کے بیان کے مطابق ابتدائی تعلیم مشن ہائی اسکول وزیر آباد میں ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے گورنمنٹ اسلامیہ کالج لاہور سے ایف۔ اے کیا۔ زمانہ طالب علمی سے صحافت سے لگاؤ رہا اور ”پھول“ نامی رسالے میں انگریزی اور دیگر زبانوں کی کہانیاں اور مضامین کے ترجمے جو راجہ صاحب لکھا کرتے تھے شائع ہوا کرتے اور شعر گوئی ورثہ میں پائی تھی لڑکپن ہی سے شعر کہا کرتے تھے خود اپنے بارے میں کہتے ہیں۔

”ان ستم ظریف بزرگوں نے درختوں کے وہ چار چار پانچ

پانچ ٹہنے رسیوں کی مدد سے ہماری کمر کے ساتھ باندھ کر

ہمیں ہندوستان کا نمائندہ پرندہ یعنی مور بنایا اور حکم دیا کہ

دوڑ دوڑ کر آنگن کے گیارہ راؤنڈ لگاؤ۔ جب ہم نے

عورتوں اور بچوں کی طرف نکلنے سے دیکھ کر ذرا پس و

پیش کی تو لاتوں، مکوں اور گالیوں سے ہماری تواضع شروع

ہو گئی اور مجبوراً ہمیں حکم کی تعمیل کرنی پڑی..... لیکن میں

نے سوچا..... راجہ مہدی علی خاں اپنی خفت مٹانے اور

بے عزتی پر صبر کرو۔ آنسو نوش کر جاؤ ہر کے پر باہر چھڑی

کے وار پر فاروق علی خاں (پھوپھی زاد بھائی) کی طرح

”ہائے میں مرا“ کہنے کی بجائے ناچو اور قہقہے لگاؤ۔ چنانچہ

میں نے خوب قہقہے لگائے اور ”آنگن میں چورنا چھیں“

گاتا رہا..... اس عمر میں بھی میں نے مور اور چور کے

قوافی کی پابندی سے اپنے فطری شاعر ہونے کا ثبوت

دے دیا تھا۔“

اس طرح راجہ صاحب کی پہلی نظم اسی حادثہ کا نتیجہ تھی۔ وہ بچپن میں بہت شریر اور

نٹ کھٹ تھے۔ ان کی شرارتوں میں بھی مزاح کا پہلو ہوا کرتا تھا۔ بچپن کی اس پٹائی کے بعد جو

نظم ”بزرگوں کے مظالم“ کی صورت میں وجود میں آئی۔

”بچوں پہ ظلم کر لو قیامت قریب ہے

اب حد سے تم گزر لو قیامت قریب ہے

اک دن فرشتے تم کو بھی پٹینگے گرز سے

یہ بات یاد کر لو قیامت قریب ہے

ہم کو لگے گی بھوک تو تریوز کھائیں گے

تم جاؤ بھوکوں مر لو قیامت قریب ہے

اور اسی طرح نظم کے آخر میں میری شاعری قدرے آزاد ہو گئی تھی اور اسے میں نے

کچھ اس طرح ختم کیا تھا۔

یوں پیٹ پیٹ ہم کو بنایا ہے تم نے مور

یوں آسماں کے نیچے مچایا ہے تم نے شور
دنیا کے سامنے کہا ہم کو حرام خور....!
تربوز کھائیں گے اجی ہم تو نہیں ہیں چور
پیروں پہ سر کو دھر لو قیامت قریب ہے

راجہ مہدی علی خاں نے انی نظموں میں کوئی تخلص استعمال نہیں کیا۔ شاذ و نادر ہی اپنا پورا نام استعمال کیا۔ بیشتر نظمیں بغیر تخلص ہیں۔ جب زرش کمار شاد نے راجہ صاحب سے ان کے قلمی نام ”تخلص“ سے متعلق استفسار کیا تو کہنے لگے کہ

”میں نے اپنے لئے کوئی تخلص کیوں نہیں تجویز کیا؟ کون کہتا ہے کہ نہیں کیا؟ بچپن میں رسوا کیا تھا۔ لیکن بزرگ لوگ کہنے لگے کہ یہ تو غنڈا ہے۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ فقروں سے جب میرا دل زخمی ہونے لگا تو میں نے گھائل تخلص رکھ لیا۔ والد صاحب جو خود بھی بغیر تخلص کے شاعر تھے یہ کہہ کر میرے اس نئے تخلص کی کھلی اڑانے لگے۔

”راجہ جی گھائل ہو گئے ہیں انہیں ہسپتال پہنچانا چاہئے۔“
میں تنگ آ کر ایک دن مسرور تخلص رکھ لیا۔ لیکن اسی دن ایک بزرگ نے مجھے پیٹ ڈالا۔ اور میں نے غصہ میں آ کر اپنا تخلص ہی غمگین رکھ لیا دو مہینے تک میرا تخلص غمگین

ہی رہا۔ ایک دن دوستوں نے مذاق اڑایا کہ جس شاعر کا تخلص ہی غمگین ہو وہ مزاحیہ نظمیں کیسے لکھ سکتا ہے۔ غصہ میں آ کر میں نے قسم کھائی کہ اب کوئی تخلص نہیں رکھوں گا۔
جب سے بے تخلص ہی چلا آ رہا ہوں۔“

یوں تو راجہ مہدی علی خاں کی ادبی زندگی کا آغاز صحافت سے ہوا۔ وہ ”پھول“ اور ”تہذیب نسواں“ ایڈٹ کیا کرتے تھے۔ اس وقت ان کی عمر بیس سال تھی۔ لیکن شاعری انہوں نے آٹھ سال ہی کی عمر سے شروع کر دی تھی۔ ڈاکٹر شکیل الرحمن کے موسومہ ایک مکتوب میں لکھتے ہیں۔

”جی ہاں! میں وہی راجہ مہدی علی خاں ہوں جو کسی زمانے میں ”پھول“ اور ”تہذیب نسواں“ ایڈٹ کرتا تھا۔ پرچوں میں میرا نام نہیں تھا۔ لیکن ایڈٹ میں ہی کرتا تھا۔ میں نے آٹھ سال کی عمر میں شعر کہنے شروع کئے۔“

ان کے علاوہ راجہ صاحب زمیندار اور نیرنگ خیال سے بھی وابستہ رہے۔ وہ ایک کامیاب مترجم تھے۔ مختلف زبانوں کے دلچپ افسانے اردو میں منتقل کرنے میں راجہ صاحب کی نمایاں خدمات ہیں۔ ان دنوں ان کے منتخب اور ترجمہ کئے گئے افسانوں کی بڑی ستائش اور پذیرائی ہوا کرتی تھی اور وہ اس طرح کافی مقبول ہو چکے تھے۔ ”نیرنگ خیال“ لاہور نہایت معیاری پرچہ تھا اس کے ایڈیٹر حکیم محمد یوسف حسین تھے۔ دہلی کے نامور جرنلسٹ

سمت پر کاش شوق کے موسمہ خط میں وہ لکھتے ہیں۔

”آج کل“ کے ادارے میں جو لوگ ہیں ان سے غیر

مطبوعہ کلام یا مضمون ”نیرنگ خیال“ کے چالیس سالہ نمبر

کے لئے حاصل کر سکتے ہیں۔ میری طرف سے سلام اور

درخواست کچھنے کے وہ اس عظیم الشان نمبر کے لئے کچھ

ضرور دیں..... یہ تکلیف اس لئے دے رہا ہوں کہ

آپ دہلی میں ہیں..... اس کیلئے میں بھی ممنون رہونگا

اور راجہ مہدی علی خاں صاحب بھی اس سے راجہ صاحب

کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۱۹۴۲ء میں راجہ مہدی علی خاں نے آل انڈیا ریڈیو دہلی میں اسٹاف آرٹسٹ کی

حیثیت سے کام کیا اور بچوں کے پروگرام کے علاوہ فوجی بھائیوں کے پروگرام ترتیب دیا

کرتے تھے۔ یہیں ان کی ملاقات ن۔م۔م۔راشد، میراجی اور اختر الایمان سے ہوئی۔ ن۔

م۔راشد شعبہ کے انچارج تھے۔ اختر الایمان نے بتایا۔

”ریڈیو پر میں اور بہت سے کاموں کے علاوہ لسٹر

Listener ”آواز“ جس میں ریڈیو کے پروگرام چھتے

تھے۔ اس کے لئے ترجمہ اردو میں کرنا بھی میرے کاموں

میں سے ایک کام تھا۔ وہیں میری ملاقات راجہ سے ہوئی۔

وہ میرے ذاتی دوست تھے۔ وہ ۱۹۴۶ء میں بمبئی آ گئے

تھے اور میں اس کے بعد بمبئی آیا۔“

۱۹۴۶ء میں سعادت حسن منٹو کی دعوت پر وہ بمبئی چلے آئے۔ اور ”فلستان لمپیڈ“

فلم کمپنی میں بحیثیت ڈائریکٹر کام شروع کیا۔ طبیعت میں چونکہ شاعرانہ رنگ تھا وہ

زیادہ دنوں اس کام سے جڑے نہ رہ سکے۔ پھر انہوں نے فلموں کے لئے گیت لکھنا شروع

کیا۔ ۱۹۶۳ء میں فلم ”آٹھ دن“ کیلئے پہلی بار انہوں نے گیت لکھے۔ اور اسی فلم میں چار نئے

چہرے بطور ایکٹرز پیش کیئے گئے تھے ان میں راجہ مہدی علی خاں، سعادت حسن منٹو، محسن

عبداللہ اور اوپندر ناتھ اشک۔ اس فلم میں راجہ صاحب نے ہیرا اشوک کمار کے بہنوئی کا کردار

ادا کیا تھا۔ یہ پہلی اور آخری فلم تھی جس میں انہوں نے اداکاری کی تھی۔ اسکے بعد وہ مستقل

فلموں کے لئے گیت لکھنے لگے۔ ۱۹۴۷ء میں فلم ”دو بھائی“ کے لئے گیت لکھے اور مقبولیت

حاصل کی۔ ان کی آخری فلم ”میرا سایہ“ تھی۔ راجہ مہدی علی خاں کا یہ عروج کا زمانہ تھا۔

انہوں نے ۱۹۴۶ء تا ۱۹۶۶ء پورے بیس سال فلمی دنیا سے وابستہ رہے۔ قیام بمبئی کے دوران

انکی شادی فرخ آباد ضلع فتح گڑھ کے نواب محمود علی خاں کی سب سے چھوٹی صاحبزادی طاہرہ

سلطانہ سے ہوئی۔ اس وقت وہ بہت ہی کم عمر تھیں آٹھویں کلاس پاس کیا تھا۔ طاہرہ سلطانہ

نے شادی کے بعد جتنی مخلص اختیار کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

”ادب کے میدان میں وہ طاہرہ سلطانہ محنتی کے نام سے

مشہور ہیں اور شاید ہندوستان اور پاکستان میں وہ واحد

ہستی ہیں۔ جو راجہ مہدی علی خاں کی طنزیہ یلغار کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔“

حسن اتفاق طاہرہ سلطانہ محنتی کا گھرانہ بھی علم و ادب کا گہوارہ رہا ہے۔ طاہرہ سلطانہ کے دادا محمد علی خاں رئیس فتح گڑھ تھے اور نانا محمد اسماعیل بیچ تھے۔ تنہیال لکھنؤ کا مشہور خاندان تھا۔ ان کے ایک خالو سر قاضی عزیز الدین احمد وزیر تھے۔ دوسرے خالو نواب معشوق یار جنگ بہادر صاحب تصنیف و تالیف (انہوں نے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز پر سوانح تاریخ جیبی کا ترجمہ کیا۔) حیدرآباد (دکن) میں کمشنر تھے۔ ایک اور خالو مظہر الحق اپنے زمانے کے مشہور بیرسٹر تھے۔ جن کے ڈرائیونگ روم کی تعریف مہاتما گاندھی نے کی تھی۔ اور ان کے نام کے ڈاک ٹکٹ بھی جاری ہوئے تھے۔ طاہرہ سلطانہ محنتی کی دو بڑی بہنیں ہیں۔ بڑی بہن شاہدہ محمود جن کے شوہر سید حبیب الدین صدیقی انعام دار آف کلس (پونہ) تھے۔ جو انگریزی اخبار ”ہیرالڈ“ سے وابستہ تھے۔ ان کے دو لڑکے ہیں وقار فاروقی عرف خالد جنہیں راجہ صاحب بے حد چاہتے تھے۔ انہوں نے آخری دنوں میں راجہ صاحب کی بڑی خدمت کی۔ دوسرے لڑکے جمیل فاروقی۔ طاہرہ سلطانہ کی دوسری بہن صابرہ محمود حیدرآباد (دکن) بیاہی گئیں۔ ان کے صاحبزادے عین الحبیب عرف الشمس جنہیں پیار سے عینی بھی کہہ کر پکارتے ہیں اپنے خالو راجہ مہدی علی خاں کی طرح فلمی دنیا میں مصروف ہیں۔ طبیعت اور مزاج میں راجہ صاحب کی جھلک نظر آتی ہے۔ بڑی بہن شاہدہ محمود طاہرہ سلطانہ محنتی کے ساتھ بمبئی میں مقیم ہیں۔ طاہرہ سلطانہ محنتی کا بچپن رام نگر ضلع نینی تال میں گذرا۔ شادی کے بعد انہوں نے

میٹرک کی تکمیل کی۔ راجہ مہدی علی خاں اپنی بیگم طاہرہ سلطانہ محنتی سے بیحد محبت کرتے تھے۔ ان سے انہیں کوئی اولاد نہ ہوئی۔ جس کا انہیں خلق تھا۔ تاہم انہوں نے اس کا غم نہیں پالا۔ بقول ڈاکٹر وزیر آغا۔

”..... پھر یکا یک کرسیوں، میزوں، بستروں، دروازوں اور کھڑکیوں میں سے رنگ رنگ کی بلیاں برآمد ہونے لگیں۔ یہ سب بلیاں راجہ صاحب اور طاہرہ سلطانہ نے پال رکھیں ہیں اور ان کے گھر میں بچوں کی کمی کو پورا کرنے کی ایک دلفریب کوشش ہے۔“

ایک زندہ دل اور خوش دل انسان کو قدرت نے اولاد کی خوشی سے محروم رکھا تھا لیکن اس خوشی کی تکمیل کے لئے راجہ صاحب نے اپنے دوست احباب اور ملنے جلنے والوں کے لڑکوں اور لڑکیوں کو اور بالخصوص اپنا بیچ و معذور بچوں کو اپنی اولاد کی طرح پیار کرتے تھے۔

بقول کرشن چندر

”یوں تو راجہ بہت نیک دل انسان تھا۔ انتہائی خاموشی سے اپنے غریب دوستوں، بیواؤں اور یتیموں کی مدد کرتا تھا اور کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دیتا تھا۔ دستور کے خلاف اُس نے آج تک اپنے کسی دوست کی کاٹ نہیں کی۔ غیبت اور تکڑم سے اُسے سخت نفرت تھی۔ اپنے اچھے

دنوں میں وہ کبھی مغرور نہیں ہوا اور بُرے دنوں میں کبھی تنگدل نہ بنا۔ غرض کہ اس طرح کی اور بھی بہت سی برائیاں مرحوم میں تھیں جو موجودہ زمانے میں کسی بھی انسان کو کامیاب بننے سے روک سکتی ہیں۔ مرحوم کو اپنی زندگی میں جو کچھ ملا۔ اس نے اسے دونوں ہاتھوں سے اپنی زندگی ہی

میں لٹا دیا۔“ ۱

ان دنوں راجہ صاحب کی دوسری شادی کی افواہ پھیلنے لگی۔ حالانکہ نہ تو انہوں نے کوئی دوسری شادی کی اور نہ کسی سے معاشقہ کیا۔ وہ ہر کسی سے نہایت خوش دلی سے ملتے تھے خواہ عورت ہو یا مرد۔ وہ اپنی ازدواجی زندگی میں خوش تھے۔ اولاد سے محرومی کے باوجود وہ اپنی بیگم طاہرہ سلطانہ سے کوئی شکایت کی اور نہ مقدر سے شکوہ کیا۔ وہ اپنی ماں بھائی بہنوں اور رشتہ داروں سے جو پاکستان میں تھے تقسیم کے بعد گویا ایک طرح سے کٹ سے گئے تھے۔ صرف خط و کتابت جاری تھی پھر یہ سلسلہ بھی منقطع ہو گیا تھا۔ رام لعل کے استفسار پر اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

”لاہور میں میری والدہ، بہنوں اور بھائی کے علاوہ بیسوں قریبی عزیز ہیں۔ کسی کا خط نہیں آیا۔ میری والدہ بہنیں اور بھائی تو مجھ سے متنفر نہیں ہیں، تو بہ کرو۔ کان پکڑو ایسی باتیں جلدی میں مت سوچا کرو۔“ ۲

نام کی مناسبت سے راجہ مہدی علی خاں کے مسلک سے متعلق لوگ غلط فہمی کے شکار ہوتے ہیں جب میں نے بیگم راجہ مہدی علی خاں سے استفسار کیا تو کہنے لگیں۔

”راجہ“ کا لفظ اس لئے اپنے نام کے ساتھ جوڑ

لیا تھا کہ کسی خاندانی بزرگ نے بتایا تھا کہ ان کے آباؤ اجداد کا سلسلہ نسب کسی راجپوت راجہ سے جا ملتا ہے۔ جبکہ ان

کے والد عنایت اللہ خاں یا ان کے چھوٹے بھائی عثمان علی

خاں نے کبھی اپنے نام کے ساتھ راجہ کا استعمال نہیں کیا۔

والد نے ان کا نام مہدی علی خاں رکھا تھا یعنی ”مہدی“

بمعنی ہدایت کرنے والا کی رعایت سے۔ راجہ صاحب کا

مسلک ”حنفیہ سنی“ ہے۔ وہ اکثر جمعہ کو ماہم کی درگاہ

حضرت خطب کو کن شیخ علی بابا مخدوم فقہیہ مہاوتمی رحمۃ اللہ

علیہ پر حاضری دیا کرتے تھے۔“ ۳

راجہ مہدی علی خاں بھاری بھر کم جسم کے مالک تھے۔ گول رعب دار چہرہ۔ گھنے

کالے بال، کشادہ پیشانی اور گہری آنکھیں ابرو سیاہ چمکدار کشادہ سینہ تھا۔ آخر دنوں میں انہیں

ذیابیطیس کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ بظاہر وہ صحت مند دکھائی دیتے تھے۔ جسم میں پانی بھر جایا کرتا

تھا۔ بہترے علاج کروایا کوئی فائدہ نہ ہوا۔ وہ حکیموں کے نسخے اور تجویز کردہ ادویات

استعمال کرتے۔ کسی نے پانی میں چونا ملا کر پینے کا مشورہ دیا کہ ذیابیطیس کے لئے مفید ہے۔

چنانچہ وہ چونا ملا ہوا پانی پینے لگے۔ جس کے نتیجے میں ان کے گردے خراب ہو گئے۔ انہیں ماہم ہسپتال میں شریک کر دیا گیا۔ ان دنوں گردوں کا عصری علاج نہ تھا۔ اذیت ناک تکلیف سہتا ہوا ہنستا ہنساتا یہ عظیم انسان آخر کار ۲۷ جولائی ۱۹۶۶ء کی صبح اس دارفانی سے رخصت ہو گیا۔ اس وقت راجہ صاحب کی عمر کوئی پچاس برس تھی۔ جب ریڈیو سے یہ خبر نشر ہوئی تو لوگوں کا اثر دھام ان کے گھر پالی ناکہ پر جمع ہو گیا۔ سرشار سیلانی اس وقت کے مشہور شاعر اور ڈائلاگ رائیٹر تھے۔ راجہ صاحب کے سانحہ پر جو دردناک منظر دیکھ کر فی البدیہہ کہا۔

تھکا ماندہ مسافر سو رہا ہے زمانہ کیا سمجھ کر رو رہا ہے

بقول پریم جی پروڈیوسر (میرا سایا) کہ

”ایک بہت بڑی شخصیت ہمارے درمیان سے چلی گئی۔

اگر وہ حیات ہوتے تو شاید اور بھی ادبی کارنامے وجود میں

آتے۔“

راجہ مہدی علی خاں کے انتقال کی خبر نے ادبی دنیا میں غم و اندوہ کی ایک ایسی فضاء پیدا کر دی کہ دنیائے ادب کے ہر شاعر و ادیب نے اپنے رنج و ملال کا اظہار کیا۔ یہاں چند ادیب و شعرا کے قطعہ تاریخیں اور تاثرات درج کئے جاتے ہیں جس سے راجہ صاحب کی عظمت اور وقعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

”بیسویں صدی“ نے یہ اندوہناک خبر صفحہ اول پر اس طرح

شائع کی۔ ”ہندو پاک میں ایکساں طور پر مقبول و ہر دل عزیز

نامور ادیب و شاعر اور طنز نگار اُردو کے عظیم المرتبت اور تاریخ ساز صحافی اور شاعر مولانا ظفر علی خاں کے حقیقی بھانجے اور پاکستان کی نامور شاعرہ محترمہ ج۔ ب۔ صاحبہ کے فرزند ولید راجہ مہدی علی خاں ۲۷ جولائی ۱۹۶۶ء کی صبح ۳ بجے ماہم ہسپتال بمبئی میں انتقال کر گئے۔ اور اس اندوہناک حادثے سے ہندو پاک دونوں ممالک کے ادبی حلقوں میں صف ماتم بچھ گئی۔ مرحوم کی ۸۰ سالہ بوڑھی والدہ اپنے لال سے ہزاروں میل دور لاہور میں خون کے آنسو رو رہی ہے۔ بد نصیب ماں اپنے بیٹے کی آخری بار صورت بھی نہ دیکھ سکی۔“

(بیسویں صدی اکتوبر ۱۹۶۶ء)

اختر واصفی گوجرانوالہ مغربی پاکستان نے قطعہ تاریخ یوں لکھی۔

تواریخ وقات طوطی ہند مہدی علی

۱۹۶۶

ارگیشن پبلیشرز واصفی

۱۹۶۶

دل پہ اختر کے ہوا کیا مرگ مہدی سے اثر کیا تباؤں جھکو میں اے خوشتر اندوہ گیں

ہائے وہ رنگیں نو اشعار ادیب زندہ دل
کون سے حاسد کی اسکو کھا گئی والے نظر
آج "آواز حزیں" سے کہد یا ہاتف نے یہ
جسکا ثانی ڈھونڈنے سے بھی نہ پائینگے کہیں
بزم یاراں کی ابھی کل تک وہ رونق تھا یہیں
"ہو گیا مہدی علی خاں عازم خلد بریں"

۱۸۷۶ + ۹۰ = ۱۹۶۶ء

ڈاکٹر وزیر آغانے اپنے مضمون "اُردو ادب کا فنا ڈو" میں راجہ مہدی علی خاں کو
"فنا ڈو" قرار دیا جو سرکس میں ایک جو کر تھا وہ اپنے سینے میں ہزاروں غم لئے لوگوں کو ہنساتا جو
اس کا پیشہ تھا۔ راجہ صاحب بھی اپنے اندر درد و کرب لئے زندگی بھر لوگوں کو ہنساتے رہے۔
لکھتے ہیں۔

"اس دنیا میں جو بھی وارد ہوتا ہے اپنا مشن اپنے ساتھ لے
کر آتا ہے۔ بعض لوگ انسان کو جہالت اور تاریکی سے
اور بعض اسے دکھوں اور آرزوؤں کے چنگل سے رہائی
دلانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر بعض ایسے بھی ہیں جو
انسان کو اپنی ذات کا عرفان حاصل کرنے کی تحریک دیتے
ہیں۔ اور یہ ایک بڑا مشن ہے۔ لیکن ایک بالکل محدود تعداد
ایسے لوگوں کی بھی ہے جو کوئی حکیمانہ یا پیغمبرانہ مقصد لے
کر وارد نہیں ہوتے۔ اُن کا کام فقط اتنا ہوتا ہے کہ وہ آگے
بڑھ کر بڑی آہستگی سے انسان کی آنکھوں سے بہتے ہوئے

آنسوؤں کو پونچھ ڈالتے اور اسے ڈراسا گدا گدا کر زندگی
کے گرجناک اندھیروں پر مسکرانے کی سکت عطا کر دیتے
ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں اسی گروہ کا ایک نامور فرد تھا.....
اس مختصر سے مضمون میں راجہ مہدی علی خاں کے فن کی
خصوصیات کو پیش کرنا مقصود نہیں۔ مقصود صرف اس کے فن
کا اعتراف ہے۔ وہ بیسویں صدی کی اُردو شاعری میں طنز
و مزاح کا سب سے بڑا علمبردار تھا۔ اور روتے ہوؤں کو
ہنسانا اسکا محبوب ترین مشغلہ تھا۔ مگر آج کہ وہ یکا یک ہمیں
اپنے آخری مذاق کا ہدف بنا کر کسی چور دروازے کے
راستے بھری بزم سے غائب ہو گیا۔"

نزیش کمار شاد نے مظلوم خراج پیش کیا۔ جو بیسویں صدی کے صفحہ اول پر راجہ
صاحب کی تصویر کے ساتھ شائع ہوا تھا۔
دل پاش پاش ہے تو کلیجہ ہے داغ داغ
خوشتر نے سچ کہا سیکہ راجہ کی موت سے
مگر جھا گیا ہے باغ طرافت کا ایک پھول
اُس کی مفارقت کو کہاں تک روئے
پیدا کہاں اب ایسا خوش اطوار خوش دماغ
جہیل ملک کے مظلوم تاثرات "اوراق" پاکستان نے شائع کیا۔
ہم فریاد کریں یا گھائل دل کو شاد کریں
ہتے لب اور روتی آنکھیں تجھ کو یاد کریں

دوزخ کو جنت میں ملایا، تو نے تو سکھ پایا
اندروں کی تیاری باہر دنیا داری
اپنی ذات پہ ہنس لینے سے رنگ اگر کٹ جائیں
ظفر سبھی یم۔ اے۔ نے قطع تاریخ لکھی۔

اُسے ہر طرف ڈھونڈتی ہے نگاہ
بڑی درد انگیز و غمناک ہے

نہیں کوئی صبر و تحمل کی راہ
”قضا راجہ مہدی علی خاں کی آہ“

۱۹۶۶ء

رام لعل نے راجہ مہدی علی خاں کے سانحہ ارتحال پر ایک طویل مضمون اپنی کتاب
”درپوں میں رکھے چراغ“ میں لکھا ہے۔ تاہم تعزیتی پیام کا حصہ یوں ہے۔ جو بیسویں
صدی نومبر ۶۶ء میں شائع ہوا۔

”روتوں کو بے دریغ ہسانے والا وہ خوش باش، خوش طبع،
خوش خلق اور خوش خور انسان آج زمین کی کتنی تہوں کے
نیچے پڑا ہوا ہماری بے بسی پر قہقہے لگا رہا ہوگا اور مصنوعی غصے
سے کہہ رہا ہوگا۔“ جاؤ میں تم میں سے کسی سے نہیں بولتا۔
آج ہماری بول چال کا فل اسٹاپ!!

کرشن چندر نے لکھا۔

”اُس کی اُونچی بے باک و معصوم ہنسی یاد آتی ہے۔ اُس کی

قنطاری کی حد تک پہنچی ہوئی ظرافت نگاری اور کھلنڈرا پن۔
وہ ایک بچہ تھا ابھی اور جب موت کسی بچے کو ہمارے بیچ
میں سے اٹھا کر لے جاتی ہے تو اس کائنات کی معصومیت
میں ضرور کہیں پر کوئی کمی ہو جاتی ہے۔“

(بیسویں صدی نومبر ۶۶ء ص ۹۳)

ریکس مینائی نے منظوم خراج پیش کیا ہے۔

آشفگان زیست کا چہرہ اتر گیا
جور ہسپار مسلک اخلاص و عشق تھا
وہ کیا ڈریگا قبر کی تاریکیوں میں بھی
اب محفل حیات ہے سونی پڑی ہوئی
اک عمر جسکے ہجر میں روئینگے یار سب
پہلے مجید و سالک و شوکت چلے گئے

مدحت الاخر نے یوں لکھا۔

اُس کا جادو کا قلم رجان ہر تصویر تھا، نوک نشتر حرف حرف جو سخن تھا تیرا، دشت و
صحرا بام و در، غنچہ و گل خار و خس زندگی کے ساتھ تھا زندگی کا ہر نفس، لیکے پھولوں کی ہنسی،
دشت میں آیا تھا وہ زندگی کی راہ میں، پیڑ کا سایہ تھا وہ روہ ہنسی چپ ہو گئی، اور وہ سایہ کھو گیا،
موت کی آغوش میں روہ مسافر سو گیا، جسکا جادو کا قلم رجان ہر تصویر تھا، روہ مصور کھو گیا۔.....!

میرزا ادیب کا تعزیتی مضمون ”اوراق“ پاکستان میں شائع ہوا جس کے چند سطور راجہ صاحب کے فن پر روشنی ڈالتے ہیں۔

”اُردو کی خوبصورت ترین مزاحیہ نظموں کا خالق چل بسا ہے۔ وہ نغمہ طرب ڈوب گیا ہے جو ہونٹوں کو مسکرا نہیں اور دلوں کو خوشیاں دیتا تھا۔ وہ قہقہہ ختم ہو چکا ہے جو پاک و ہند کے فضاؤں میں گونج رہا تھا۔ اور دھوپ کی طرح ہر گھر میں پہنچ جاتا تھا۔ میں نے راجہ کو کہا تھا.... ”سنا ہے بمبئی میں مردہ زندہ ہو گیا ہے۔!“ اب میں کس سے مخاطب ہو کر کہوں.... بمبئی میں اُردو کی سچی مزاحیہ شاعری مر گئی ہے۔“

ڈاکٹر شکیل الرحمن ڈی۔ لٹ نے طویل تعزیتی مضمون لکھا جو بیسویں صدی اکتوبر

۶۶ء کے شمارے میں شائع ہوا۔ جس کا اقتباس ملاحظہ ہو۔

یہ آدمی بچے کی نفسیات کے مطالعہ کے لئے اہم مواد تھا.... ایک بچے کی معصومیت، ایک بچے کی ضد، ایک بچے کا بھولا پن، ایک بچے کی خوشی، ایک بچے کا غصہ، ایک بچے کی مسکراہٹ، ایک بچے کا خواب..... میں نے راجہ مہدی علی خاں میں کیا نہیں دیکھا ہے..... میں اس بچے کو بھول نہیں سکتا.... عجب نام تیرا لیجئے تب چشم بھر آدئے۔!

خوشتر گرامی ایڈیٹر بیسویں صدی سے راجہ مہدی علی خاں کی اس قدر گہری دوستی تھی کہ جس کی مثال قائم ہو گئی تھی لکھتے ہیں۔

”تقسیم وطن سے پہلے سے راجہ مہدی علی خاں فلمی دنیا سے وابستہ تھے لیکن اس کے باوجود وہ ”فلمی شاعر“ نہیں بلکہ ایک صاحب طرز طنز تھے۔ فلمی شاعری کرنا محض ان کا ذریعہ معاش تھا۔ فلمی دنیا میں بلبل ہزار داستان کی طرح وہ برسوں چپکتے رہے۔ مگر ادب کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑا.... فلمی دنیا میں برسوں چپکنے کے بعد یہ بلبل ہزار داستان ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ دوسروں کو ہنسانے والا ہمیں رُلا کے جا چکا ہے۔ لیکن اس کے قہقہے ہمیشہ ایوان ظرافت میں گونجتے رہینگے۔“

راجہ مہدی علی خاں کو ان کی وصیت کے مطابق ماہم قبرستان میں ان کی آخری آرام گاہ بنائی گئی۔ جلوس جنازہ میں ہزاروں سوگوار شریک تھے۔ حسن اتفاق جب جنازہ لے جایا جا رہا تھا سڑک کی دونوں جانب عمارتوں سے ریڈیو سیلون سے راجہ مہدی علی خاں ہی کے گیت گونج رہے تھے۔ ”لگ جاگلے کے پھر یہ ملاقات ہونہ ہو“ ہر ایک کی آنکھیں اشکبار تھیں لاکھوں تعزیتی خطوط بیگم طاہرہ مہدی علی کو لکھے گئے۔ ہندو پاک کے اخباروں ادبی رسالوں اور جرائد میں سینکڑوں تعزیتی مضامین نشر و نظم شائع ہوئے۔ جن کا احاطہ مشکل ہے۔

عادات و اطوار کے اعتبار سے راجہ مہدی علی خاں جسقدر نرم دل واقع ہوئے تھے مزاج اتنا ہی گرم تھا۔ طبیعت کے خلاف کوئی بات برداشت نہ کرتے تھے۔ لذیذ کھانوں اور مرغ و ماہی کے شوقین تھے۔ سالن میں نمک یا مرچ ذائقہ سے زائد ہو جائے تو برتنوں کی خیر نہ ہوتی۔ کانشی ناتھ (باورچی) اور طاہرہ سلطانہ کی خبر لی جاتی۔ گھر میں آئے دن دعوتیں ہوا کرتی ہیں۔ وہ کھانے اور کھلانے کے بڑے شوقین تھے۔ بقول پران (مشہور فلمی اداکار ویلن) کہ ”لوگ اکثر کھاتے ہیں جینے کیلئے لیکن راجہ صاحب جیتے ہیں کھانے کیلئے۔“ حیدرآبادی ”پائے“ طاہرہ سلطانہ خود بڑے اہتمام سے بنایا کرتیں۔ سبزی ترکاری کو گھاس پھوس کہا کرتے تھے وہ گوشت خور تھے۔ مرغن غذاؤں کی وجہ جسم بھاری ہو گیا تھا وہ پہلے ہی دوہرے جسم کے مالک تھے۔ چائے دودھ کیساتھ دن میں دو تین مرتبہ پیتے اور شکر حسب ذائقہ ڈال لیا کرتے تھے۔ جب انہیں ذیابیطیس ہو گیا تو شکر سے پرہیز کرنے لگے تھے۔ مٹھائی کے بڑے دلدادہ تھے پرہیز کے باوجود آنکھ بچا کر چٹ کر جاتے۔ طاہرہ سلطانہ ان کا بڑا خیال کرتی تھیں۔ سبھی پھل موسم کے بڑے شوق سے کھاتے لیکن انہیں غالب کی طرح آم بڑے مرغوب تھے۔ شراب سے سخت نفرت تھی۔ گھر کی نجی محفلوں میں کوئی شراب پیتا تو بڑی کراہیت محسوس کرتے۔ ایک دفعہ فلمی اداکارہ سادھنا کی شادی میں کسی نے شراب پلا دی۔ جب نشہ اترتا تو اس پر برہم ہو گئے۔ سگریٹ کے عادی نہ تھے لیکن کبھی کبھار یار دوستوں کی خاطر پی لیا کرتے۔ کچھ دن حقہ پینے کا شوق ہوا تھا پھر اُسے بھی ترک کر دیا۔ البتہ پان کے رسیا تھے۔ پان میں زردہ بہت زیادہ کھاتے۔ راجہ صاحب کے پان کھانے کا منفرد انداز تھا۔

پان منہ میں رکھا تھوڑا سا چبایا اور لطف لے کر اُگالداں میں تھوک دیتے۔ اُگالداں پان کی پیک سے بھر جاتا۔ دن میں دس بارہ مرتبہ صاف کرنے کی نوبت آتی۔ گویا ایک خادمہ صرف اُگالداں کی صفائی کے لئے مختص تھی۔ لباس ہلکا پھلکا پہنتے تھے۔ یعنی گھر میں یوں تو بنیان اور تہہ بند ہوا کرتی اور کبھی کرتے پہن لیتے اور باہر جائیں تو پینٹ بوشرٹ ٹائی کوٹ اور شوز پہنتے۔ گھر میں عام طور پر چپل ہی استعمال کیا کرتے تھے۔ زندگی میں انہوں نے شيروانی یا کرائی اور لباس زیب تن نہیں کیا۔ ہلکے اور مہذب رنگ پسند تھے۔ کھیل کود وغیرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ البتہ کبھی کبھی جاگنگ کو نکل جاتے۔ گرمی انہیں برداشت نہ ہوتی تھی۔ دن میں دو تین بار ٹھنڈے پانی سے غسل کرتے۔ صبح جب وہ غسل سے فارغ ہوتے تو ان کا ملازم ان کے پاؤں پونچھتا اور بیگم مہدی انہیں کپڑے پہناتیں بالوں میں تیل ملتی اور کنگھی کرتیں۔ اس کے بعد راجہ صاحب صبح کی نماز سے فارغ ہو کر اپنی مخصوص کرسی ”راکنگ چیر“ پر براجمان ہو جاتے۔ اس دوران ملاقاتی آتے تو ان سے ملاقات کرتے۔ اس تعلق سے ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

”عام طور سے اپنی جھولا نما کرسی چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔

خود مہمان ان کی راکنگ چیر کے رکنے یا تیز تیز چلنے ہی

سے راجہ صاحب کے موڈ کے بارے میں اندازہ کر لیتے

ہیں۔ مثلاً اگر مہمان کی آمد پر کرسی میں زلزلہ آجائے تو اس

کا مطلب یہ ہے کہ مہمان سامنے بچھے ہوئے صوفے کے

آخری کونے میں بخوشی بیٹھ سکتا ہے۔ اور اگر کرسی دفعتاً رک جائے اور راجہ صاحب کی زبان کانٹھی ناتھ کو اس کے سلسلہ نسب کے بعض نازک مقامات سے آگاہ کرنے لگے تو مہمان فوراً جان لیتا ہے کہ صورت حال خطرناک ہے۔“

ملاقاتیوں میں اگر کوئی حاجت مند ہو تو راجہ صاحب حتیٰ المقدور امداد کرتے۔ کوئی سفارش کے لئے آتا تو سفارشی خطوط لکھ دیتے۔ بیروزگار ہو تو کام دلوا دیتے۔ جب تک کسی کو کام نہ ملے وہ راجہ کی جیب سے وظیفہ پاتا۔ غریبوں، بیواؤں، یتیموں کی امداد میں روحانی تسکین محسوس کرتے۔

بقول خوشترگرامی

”بیگم سے کہتے یہ غریب آدمی جو آیا ہے اسے پچاس روپے دے دو۔ اس بیچارے کو اپنی بیٹی کا کنیادان کرنا ہے اسے فوراً دو سو روپے دے دو۔ اسے فلم میں کوئی کام نہیں ملا۔ فی الحال اسے سو روپے دے دو..... طاہرہ! یہ عورت بہت تنگدست ہے اسے کچھ دے دو۔ پھر ڈاک کی چھان بین ہوتی۔ ڈاک سے آئے ہوئے تمام خطوط خود بہ نفس نفیس کھول کر پڑھتے اور خود ہی جواب لکھتے۔“

راجہ مہدی علی خاں ایک مخلص اور دردمندوں کے مالک تھے۔ خطوط کے جواب لکھنا فرض اور لین سمجھتے تھے۔ خطوط ہی کے ذریعہ گئی دوست بن گئے تھے۔ ادبی دنیا اور فلمی دنیا میں ان کے لاکھوں پرستار تھے۔ مخلص دوستوں پر جانثار کرتے۔ ریاکار دوستوں کو تازہ لیتے اور وہ ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان سے ملنا تک گوارا نہ کرتے۔ خوش اخلاق ملنسار اور قہقہہ باز آدمی تھے۔ ان کی باتیں لطیفوں کی طرح ہوا کرتیں۔ بات میں بات پیدا کر کے محفل کو لالہ زار بنادیتے جو کوئی ایک بار ان سے ملے بار بار ملنا چاہتا اور ان کی ایک ملاقات یادگار ملاقات بن جاتی۔ حافظہ بلا کا پایا تھا۔ دوستی میں بیہودہ مذاق اور بے حیائی پر برہم ہو جاتے۔ ادبی مذاق پر خود بھی قہقہہ لگا دیتے۔ بظاہر تو وہ جاہ و جلال کے آدمی تھے لیکن ان کا دل نہایت نرم اور محبت سے لہریز تھا۔ بڑی بے تکلفی سے ملتے جیسے بہت پرانی ملاقات ہو۔ ان کی تحریروں میں بالخصوص خطوط میں وہی بے تکلفی اور بے باکی ہے۔ رعب دار چہرہ اور بھاری بھر کم آواز سے لوگ گھبرا جاتے تھے۔ جو بھی گھر آتا بڑی تو انج ہوتی۔ ضیانتوں کے رسیا تھے۔ کبھی کوئی ان کے گھر سے بھوکا نہیں لوٹا۔ جوتشوں کی بڑی قدر کیا کرتے۔ آخری دنوں علم نجوم پر بڑا عقیدہ ہو گیا تھا۔ بخاری صاحب کی جو Astrologist تھے بڑی عزت کرتے۔ انہوں نے بتایا تھا کہ راجہ صاحب کا ستارہ عقرب ہے۔ اور آٹھ نمبران کے لئے نہایت فائدہ مند ہے۔ وہ ہزاروں روپے نجومیوں پر خرچ کر ڈالتے تھے اور اکثر دھوکے بھی کھا جاتے۔ علم نجوم کی ڈھیروں کتابیں انہوں نے جمع کر رکھی تھیں۔ اور ان کا مطالعہ بڑے انہماک سے کیا کرتے تھے۔

ڈاکٹر شکیل الرحمن نے اپنے مضمون میں بھی ایک واقعہ لکھا ہے جس سے راجہ صاحب کے اس عقیدہ اور ان کی چلبلی طبیعت کا اندازہ ہوتا ہے۔

”میں صرف دو برس اور زندہ رہوں گا!“ راجہ مہدی علی خاں نے پانی کا گلاس ختم کرتے ہوئے کہا..... کس الو کے پٹھے نے کہہ دیا آپ سے! میں نے جھنجھلا کر کہا۔

”ایک نجومی نے..... انہوں نے اپنے خاص انداز سے کہا۔ بہت بڑا نجومی ہے۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے میرے بارے میں سب کچھ کہہ دیا..... آپ ملیں گے تو چہرہ دیکھتے ہی کہہ دیگا کہ شکیل الرحمن کی کتنی محبوبائیں ہیں اور اس مکار نے کتنی لڑکیوں سے عشق کیا ہے..... میں پان چباتے ہوئے ان کے قریب چوکی پر بیٹھ گیا اور سامنے پڑی ہوئی ایک کتاب الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ وہ پامسٹری کی کتاب تھی۔

”راجہ صاحب! پامسٹری کی ان کتابوں کو الماری میں بند کر دیجئے نجومیوں سے ملنا چھوڑ دیجئے۔ خدا کی قسم عمر بڑھ جائیگی۔ میں نے مشورہ دیا۔“

پامسٹری کی ڈھیر ساری کتابیں جمع کر رکھی تھیں آخر عمر میں راجہ صاحب کو کچھ ایسا

عقیدہ ہو گیا تھا کہ جو بھی ان سے ملنے آتا راجہ صاحب اُس کے ساتھ یہی گفتگو کرتے۔ ان دنوں کوئی نہ کوئی نجومی آ جاتا۔ اور راجہ صاحب اندھی عقیدت میں دھوکا کھا جاتے۔ طاہرہ سلطانہ (بیگم راجہ مہدی علی خاں) نیک نفس اور فرمانبرداری میں سب کچھ سہہ جاتیں۔ ایک دفعہ ایک ”بابا“ گھر آ گئے اور کچھ ایسے راجہ صاحب کو اپنا گرویدہ بنا لیا کہ راجہ صاحب اس کی بڑی تواضع اور کئی دنوں اپنے ہاں مہمان رکھا۔ ان دنوں طاہرہ سلطانہ کو بڑی زحمتیں اٹھانی پڑی۔ دن میں کئی بار چائے وغیرہ کا انتظام کرنا بابا کی فرمائیشی کھانے تیار کرنا۔ وغیرہ کافی دنوں بعد وہ رخصت ہوا تو راجہ صاحب نے اسے تحفے تحائف اور نقدی دے کر رخصت کیا۔ کچھ دنوں بعد ایک عورت بابا کو تلاش کرتی ہوئی راجہ صاحب کے گھر پہنچی اور کہا ”وہ“ کہاں ہے؟ راجہ صاحب کے دریافت کرنے پر یہ عقدہ کھلا کہ وہ عورت بابا کی بیوی ہے جبکہ بابا نے انہیں ”مجرد“ بتایا تھا۔ جب دوسری مرتبہ وہ آیا تو راجہ صاحب نے اسے دھکے دے کر باہر کر دیا۔ اس طرح راجہ صاحب کئی دفعہ ان ڈھونگیوں سے دھوکا کھاتے رہے تاہم ان کے اس عقیدے میں کوئی فرق نہ آیا۔

رام لعل اپنے ایک مضمون میں جو انہوں نے راجہ صاحب کے انتقال کے بعد ان کے بارے میں لکھا تھا اس میں رقم طراز ہیں۔

”وہ کیریوز کی نیومولوجی میں بھی اعتقاد رکھتے تھے۔

انہوں نے اپنے اور میرے ناموں کے اعداد و شمار نکال کر

میرے ساتھ ہاتھ ملا کر کہا۔ ”میری اور تمہاری دوستی کبھی

ہے۔ کبھی نہیں ٹوٹے گی۔“ میں نے انہیں ان کی غلطی کا احساس دلایا کہ انہوں نے میرا نمبر غلط نکالا ہے تو کتاب کے مطالعہ میں پھر کھو گئے اور پھر بڑی مایوسی کا اظہار کیا۔ میں نے ان کی بات غلط ثابت کر دی تھی۔ لیکن انہوں نے اور کتنے دوستوں اور عزیزوں سے جن کے ساتھ اپنے رشتے کو مستحکم تر سمجھتے تھے۔ ۲۷ جولائی کو اچانک انتقال فرما کر اپنی اور دوسروں کی خوش فہمی دور کر دی ان کی باتوں میں یقین نہ رکھ کر میں نے خود کو کتنے بڑے صدمے سے بچا لیا ہے۔ ایک مخلص دوست کی موت کا صدمہ برداشت کر کے میں نے ایک وہم سے بھی نجات پالی ہے یہ دونوں موتیں کتنی متضاد قسم کی ہیں۔“ جگدیش بھل نے کہا۔

”راجہ مہدی علی خاں نہایت شگفتہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ جب کبھی ہم اپنی طبیعت میں بوجھل پن محسوس کرتے ان کے ہاں چلے جاتے۔ ان کی شگفتہ باتوں سے طبیعت ہلکی ہو جاتی۔ ساری اُلجھنیں پریشانیاں دور ہو جاتیں۔ وہ مجھے دیکھتے ہی کہتے۔ ”آج کیسے آنا ہوا....“ میں کہتا۔ بندے کو پیسے سے زیادہ اور کیا ضرورت ہوگی!....“ ”پرسوں ہی تو

دس کروڑ دیے تھے۔ اتنا جلدی ختم ہو گئے؟“ اس بار پندرہ کروڑ رکھ لو..... پھر آئندہ پھوٹی کوڑی نہ ملے گی!....“ اور ہم ان کی ان پر لطف باتوں سے محفوظ ہوتے۔ وہ کبھی خود کے بھاری بھر کم جسم اور ڈیل ڈول پر بھی لطیفے جڑ دیا کرتے۔ ہم ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہو جاتے۔ وہ میری بیگم (عالیہ) سے ”حیدرآبادی بیگم“ کھلانے کی فرمائش کرتے۔ جب کبھی گھاس پوس کھانے کی خواہش ہوتی وہ ہمارے گھر چلے آتے۔ دل کے وہ راجہ تھے بے سہاروں کے سہارا، غمزدہ اور پریشان حال لوگوں کیلئے مسیحا تھے۔“

راجہ مہدی علی خاں طبعاً عاشق مزاج تھے۔ لیکن چھچھورا پن قطعی برداشت نہیں کرتے تھے۔ کسی پر غصہ آجاتا تو سخت برہم ہو جاتے لیکن فوری معمول پر آ جاتے تھے ان کا غصہ وقتی ہوا کرتا تھا۔ اور پھر وہی ہنسنے ہنسانے کی باتیں ہوتیں۔ انہیں غم تھا تو فقط اپنی بگڑتی صحت کا۔ اولاد سے محرومی کا اور اپنی ماں کا..... لیکن اس کا احساس کبھی اپنے چہرے سے تک ظاہر نہیں کیا۔ ڈاکٹر وزیر آغا لکھتے ہیں۔

”حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ شخص جسکی زندگی ایک مسلسل کرب کی تصویر تھی جب شعر کہنے لگتا تھا تو اس کے قلم سے خون کی بجائے امرت چھلکتا تھا۔ آنسوؤں کی بجائے تبسم

ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاتا تھا۔ اور ایک عالم اس کی بیٹھی کوئل باتوں میں اپنے دکھوں کا مداوا تلاش کرتا تھا۔ مسعود شاہد مرحوم نے کسی زمانے میں سرکس کے ایک مسخرے فناؤڈ کے بارے میں ایک افسانہ لکھا تھا کہ کس طرح فناؤڈ کا دل رورہا ہوتا تھا اور زبان محفل کو زعفران زار میں تبدیل کرتی جاتی تھی۔ میں سوچتا ہوں کہ راجہ مہدی علی خاں بھی تو اردو ادب کا فناؤڈ تھا کہ ہر چند اس کی اپنی ذات دکھوں، محرومیوں اور نارسا آرزوؤں کی آماجگاہ تھی۔ لیکن اس کی زبان اور قلم خوشیوں اور قہقہوں کی تقسیم پر مامور تھے۔“ ۲

کبھی گھر کی نوک جھونک گیت یا نظم میں ڈھل جاتی تو روزمرہ زندگی کے چھوٹے موٹے واقعات موافراہم کر دیا کرتے۔ ایک دفعہ بیگم ان کے غصہ کی وجہ روٹھ گئیں پھر تھوڑی دیر بعد انہیں مسکراتے دیکھا اور بس راجہ کی زبان پر بے ساختہ مصرعہ آ گیا۔ ”آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے“ پھر کیا تھا یہ فلمی گیت بن گیا۔ اکثر وہ بسوں، ٹرین یا کبھی کبھی چلتے پھرتے، بیٹھے بیٹھے ہی شعر کہہ دیا کرتے تھے۔ انہوں نے اپنا ایک پرسنل سکریری بھی رکھا تھا۔ جس کا تخلص انہوں نے وفارکھا تھا۔ اس لئے کہ اس پر انہیں کوئی اعتبار نہ تھا۔ خطوط کے جوابات ہو یا گیت کی نقل یا پھر نظموں کو پریس بھیجنا ہوتا تو خود ہی اپنی نگرانی میں انجام دیتے۔ سکریری برائے نام تھا بے کار لوگوں کو کوئی نہ کوئی کام سے لگا دیتے تھے۔ راجہ مہدی علی خاں

کے دوستوں کی بڑی لمبی فہرست ہے۔ جن میں قابل ذکر سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، شاہد احمد دہلوی، خوشتر گرامی، شکیل بدایونی، قتیل شفائی، ڈاکٹر وزیر آغا، انور سدید، کرشن چندر، خواجہ احمد عباس، اختر مرزا، محمد طفیل احمد، کلیم یوسف حسین، کرنل سلیم، میجر سلیم، جگدیش بھل، اعظم راہتی، اوپندر ناتھ اشک، انصاری، اختر الایمان، سلیمان اریب، جانثار اختر، مجروح سلطانپوری، رام لعل، سمت پرکاش شوق وغیرہم۔ ہندوستان، پاکستان اور دیگر ممالک میں راجہ صاحب کے چاہنے والوں کی کثیر تعداد تھی جن سے وہ خط و کتابت کیا کرتے تھے۔ نئے نئے دوست بنانا اور ان سے والہانہ محبت کرنا۔ اپنوں اور اجنبیوں سے بے تکلف ہو جانا راجہ صاحب کی طبیعت کا خاص وصف تھا۔ یہی وجہ تھی کہ ایک بار ملنے والا شخص انہیں ہمیشہ یاد رکھتا تھا۔ اور آج بھی جبکہ ان کے گزرے ہوئے چالیس سال سے زائد عرصہ بیت گیا۔ پھر بھی ان کی یادوں کی شمع روشن ہے۔ فلمی دنیا میں بھی ان کے عقیدتمندوں کی کافی تعداد ہے بڑے احترام سے ان کا نام لیا جاتا ہے۔ پریم جی پروڈیوسر نے بتایا۔

”آج ہمارے درمیان وہ مہمان آتما نہ رہی۔ ایسے لوگ

بہت کم جنم لیتے ہیں۔“ ۱

راجہ مہدی علی خاں زندہ دلی کیساتھ ساتھ روشن خیال اور آزاد منش آدمی تھے۔ انہوں نے ہمیشہ مذہبی وسیع نظری کا مظاہرہ کیا ہے۔ ان کا دل تعصب و عناد سے پاک تھا۔ وہ ہندو مسلم، ذات پات کا کوئی بھید بھاؤ نہیں رکھتے تھے بلکہ بلا تکلف کچھ ایسے جملے کہہ جاتے کہ لوگ ان جملوں میں ظرافت کی وجہ کوئی اثر لئے بغیر لطف اندوز ہوتے۔ مثلاً نریش کمار شاد کو

دیئے گئے انٹرویو کے چند جملے ملاحظہ ہو۔

”تو نئی دلی سے بمبئی میں میرا انٹرویو لینے چلا آیا۔ کیا تو بہت بڑا بے شرم ہے؟ اگر ہے تو تو کیوں ہے میں کیوں نہیں؟ بھلے آدمی یہ تو سوچ کہ میرا انٹرویو لینے سے قوم، میرا مطلب ہے شاعروں کی قوم پر تیرا کیا امپریشن پڑیگا؟ مزاح نگاروں کی دل آزاری ہوگی۔ اے ناعاقبت اندیش کمار! اگر تو مسلمان ہو گیا تو کبھی نہیں بخشا جائیگا۔“ ۲

کبھی انہوں نے اپنے ہندو دوستوں کو ہندو اور مسلمان دوستوں کو مسلمان نہیں جانا بلکہ انسان کو انسان اور انسانیت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے۔ ان کی نظر بڑی پاک و صاف تھی جتنا کہ ان کا دل۔ وہ اپنے خطوط میں بھی بڑی بے باکی کیساتھ اس قسم کے جملے استعمال کرتے تھے۔ رام لعل کو لکھتے ہیں۔

”نو سو برس کے بڑھے کھوسٹ مسلمان..... مسٹر اللہ رکھا عرف رام لعل! سلام علیکم! شرم نہیں آتی کہ نوجوان ہندو پر خواہ مخواہ رعب ڈالتے ہو۔ تم لوگوں کی ذات ہی کچھ ایسی ہے۔ جھوٹے رعب داب کے سوار کھا ہی کیا ہے۔ ایک تو

میرے دو سو خطوط کا جواب نہیں دیا.....“ ۱

رام لعل کے خط میں کس قدر بے تکلفی اور بے باکی ہے ایک اور خط ملاحظہ ہو۔

”میں نے خط میں Pure گھی کا دھبہ لگا کر بھیجا تھا جسے تم مٹی کا تیل یا پٹرول کہہ رہے ہو۔ ہندوستان میں تم لوگوں نے اقلیتوں کی یہی حالت بنا رکھی ہے۔ ان بچاروں کا خالص گھی بھی تم لوگوں کو پٹرول معلوم ہوتا ہے۔ افسوس! مہاتما گاندھی اور پنڈت جواہر لال جی کی نصیحتیں اور لکچر تم لوگ کتنی جلدی بھول گئے۔“ ۲

راجہ مہدی علی خاں کا عقیدہ تھا کہ انسان کی عظمت اس کی انسانیت سے ہے ناکہ اس کی رنگ و نسل سے مذہب یا دھرم کا تعلق اس کی روح سے ہوتا ہے جسم سے نہیں۔ وہ رواداری اور بھائی چارگی کے حامی تھے۔ جسم کا وجود روح کی موجودگی سے ہے اور جب روح نکل جائے تو جسم کی اہمیت باقی نہیں رہ جاتی۔ اس خیال کو راجہ صاحب نے رام لعل کے خط میں کچھ اس طرح لکھا ہے۔

”تسلیم کے بعد عرض ہے کہ میں مر گیا تھا۔ ایک ٹانگ مسلمانوں نے قبر میں دفن کر دی، ایک ٹانگ ہندوؤں نے جلادی۔ سر سکھ لے گئے۔ ایک بازو مہاتما بدھ کے پجاری لے گئے۔ باقی حصہ کتے کھا گئے..... یہ ہوا میرا انجام....

فقط..... مرحوم“ ۱

اس طرح وہ اپنی ظرافت سے غیر مسلم ادیبوں اور شاعروں میں ہر دلعزیز تھے اور

خود بھی اپنے ناموں کے ساتھ ہندو نام جڑ لیا کرتے مثلاً راجہ مہدی علی خاں بھائیہ، پنڈت راجہ مہدی علی خاں، راجہ رام علی خاں، راجہ ہندو علی خاں وغیرہ۔ راجہ مہدی علی خاں ”سیاست“ سے دور رہا کرتے تھے۔ ان کا تعلق نہ تو کسی سیاسی گروہ سے تھا نہ کسی تحریک سے وہ وابستہ رہے۔ نریش کمار شاد نے ان سے ان کی سیاسی نظریات سے متعلق سوال کیا تو انہوں نے جواب دیا کہ

”بڑا خطرناک آدمی ہے تو میرے یار! جو مجھ سے ایسا خوفناک سوال پوچھ رہا ہے کہ میرے سیاسی نظریات کیا ہیں؟ کیا تو مجھے قید کرا کے میری جائیداد پر خود قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اور پھر میں اگر یہ کہوں کہ کمونسٹ ہوں تو کانگریسی حضرات تھو تھو کریں گے۔ اور بھٹی کی پبلک مجھے پیٹ ڈالے گی۔ اور اگر کہوں کہ کانگریسی ہوں تو خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی اور راجگو پال اچا رہ میرا حقہ پانی بند کر دیں گے۔ رہا سوشلزم تو وہ مجھے معلوم نہیں کہ کیا ہوتا ہے۔ ایک موچی سے پوچھا تو اس نے بتانے سے انکار کر دیا۔“

حالانکہ یہ وہ دور تھا کہ آدمی کے سیاسی نظریات بدل رہے تھے۔ اور سیاسی حالات سے ادیب و شاعر بھی متاثر ہو رہے تھے۔ شاعری بھی متاثر تھی۔ لوگوں میں انقلابی جوش تھا۔

اور پھر ملک کی تقسیم کے بعد ہندو مسلم نظریات میں بہت بڑا فرق آ گیا تھا۔ ہندو مسلم کے متنفر جذبات بھڑکنے لگے ملک فسادات کی لپیٹ میں آ گیا تھا۔ ہر طرف عزت و ناموس کے لالے پڑ گئے تھے۔ حالانکہ فلم انڈسٹری شروع ہی سے ہندو مسلم کے بھید بھاؤ سے پاک تھی۔ ان کے ہاں ذات پات کی کوئی دیوار نہ تھی یہاں صرف فن اور فنکار ہی کی پہچان تھی۔ ان حالات میں فلم انڈسٹری مالی مشکلات کا شکار ہو گئی جسکی وجہ فلمی دنیا سے جڑا ہوا ہر شخص معاشی پریشانیوں کا شکار تھا۔ ۱۹۵۷ء میں راجہ صاحب بھی معاشی اعتبار سے پریشان ہو گئے تھے۔ وہ ان حالات سے بھی دل برداشتہ ہو گئے تھے یہاں تک کہ واپس پاکستان جانے کا ارادہ کر لیا تھا۔ جب مدن موہن جی (میوزک ڈائریکٹر) جو راجہ صاحب کے گہرے دوست تھے انہیں پتہ چلا کہ راجہ پاکستان لوٹنا چاہتے ہیں تو وہ فوراً ان کے گھر پہنچے اور انہیں روک لیا۔ پھر سے گیت لکھنے کا حوصلہ دیا۔ فلم ”دو بھائی“ کے گیت لکھوائے اور یہی گیت ان کی شہرت کا پہلا زینہ ثابت ہوئے۔ مدن موہن جی اور راجہ مہدی علی خاں کی دوستی ان کے آخر دم تک برقرار رہی۔

راجہ صاحب کا مزاج قلندرانہ تھا۔ گھریلو حالات بھی کچھ ایسے نہ تھے کہ راجہ صاحب کو روزگار کے لئے در بدر ٹھوکریں کھانے پر مجبور کرتے۔ والد کی زمینداری تھی لیکن راجہ صاحب سیر پانے کے دلدادہ تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایف۔ اے (انٹرمیڈیٹ) کے بعد صحافت سے وابستگی اختیار کی۔ اپنے آبائی گاؤں سے لاہور آنے کا تذکرہ ”مثنوی تاج دین معراج دین“ میں یوں کیا ہے۔

میں لکھنے سے پہلے یہ کرتا ہوں طے

یہ انیس سو تیس کا ذکر ہے

یہاں سے میں پہنچا ہوں لاہور میں

سمجھ لیجئے انگریز کے دور میں

میں ہوں اور پنجاب کے زندہ دل

وہ رخسندہ چہرے وہ تابندہ دل

میں گھر سے نکل آیا بازار میں

سمجھ لیجئے کوٹ اور شلوار میں

(”انداز بیاں اور“)

ریڈیو اسٹیشن کی کشش نے انہیں دہلی کی طرف کھینچا۔ یہاں سے ان کے ذوق سلیم نے انہیں فلمی دنیا تک پہنچا دیا اور تقسیم ملک کے بعد وہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ راجہ صاحب گھر سے بزرگوں کی اجازت کے بغیر نکل پڑے تھے اسی وجہ سے ان کے والدین بھائی بہن وغیرہ ان سے ناراض تھے حالانکہ ایسا کوئی واقعہ نہیں ہوا۔ راجہ صاحب چونکہ ہندوستان میں ہی مستقل سکونت اختیار کر لی اور یہیں شادی کے بندھن میں بندھ گئے۔ ان کا پاکستان آنا جانا بھی نہ رہا اور ملک کے حالات بھی کچھ ایسے ہو گئے تھے کہ پاکستان آنا جانا اتنا آسان نہ تھا۔ شادی کے بعد وہ اپنی بیگم طاہرہ سلطانہ کیساتھ صرف ایک مرتبہ اپنے وطن گئے تھے۔ پھر اس کے بعد صرف خط و کتابت ہی کا سلسلہ رہا۔ راجہ صاحب کے انتقال

کے بعد یہ سلسلہ بھی بند ہو گیا۔

راجہ مہدی علی خاں کا ذریعہ معاش ان کی فلمی شاعری تھی۔ وہ فلمی گیتوں کا معاوضہ

بہت کم لیتے تھے اور اس معاملے میں وہ سخت تھے لیکن کسی کو بخشتے نہ تھے۔ پروڈیوسروں کی

بے رحمی اور سنگدلی، فنکاروں کے معاوضوں کی ادائیگی میں لا پرواہی اور اس کے ساتھ ساتھ

ایک فنکار کی مجبوریوں کا احساس بھی سامنے آتا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ کہ راجہ صاحب

باوجود اپنی مجبوریوں کے اپنی اعلیٰ ظرفی کا مظاہرہ کرتے تھے۔ خود ان کی طبیعت کی سادگی

فطری اور خاندانی تھی۔ اپنی مصیبتوں اور پریشانیوں کا خندہ پیشانی سے مقابلہ کرتے تھے۔

کبھی ان کی پیشانی پر بل نہ پڑا اور نہ کبھی ان کے چہرے پر الجھنوں کے آثار نمودار ہوئے۔ وہ

ہمیشہ خوش و خرم رہا کرتے تھے۔ ہنسا ہنسانا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ وہ اپنی بیماری کے دنوں میں

بھی ظرافت سے باز نہ آتے تھے۔ نرسنگ ہوم کے ملازم نرس، ڈاکٹرس وغیرہ سے بلا تکلف

مذاق کیا کرتے تھے یہی وجہ تھی کہ لوگ ان سے گھل مل جاتے تھے۔ رام لعل اپنی رپورتاژ میں

ایک واقعہ لکھا ہے کہ

”ایک کن جسیڈ چار منزلہ اسپتال، دوسرے فلور پر ایک

نرس نے رہنمائی کی۔ میں.... دستک دے کر سامنے جا کر

کھڑا ہو گیا ہوں۔ دروازہ تو پہلے سے ہی کھلا ہے۔ ایک

پلنگ پر چند خواتین بیٹھی ہنس رہی ہیں۔ دائیں طرف

دوسرے پلنگ پر دو میل نرس ایک بے حد گٹڑے آدمی کے

بدن کی مالش کرنے میں جٹے ہیں۔ میں راجہ صاحب کو دیکھتے ہی پہچان گیا ہوں۔ میرے ہاتھ میں چمڑے کا بیگ دیکھ کر ایک خاتون (بیگم راجہ مہدی علی خاں) جلدی سے راجہ صاحب کی طرف لپکتی ہے۔ ”اٹھئے اٹھئے! ڈاکٹر صاحب آئے ہیں.....!“ میں کہنا چاہتا ہوں لیکن راجہ صاحب نے زور سے آنکھیں میچ لی ہیں....“ میں سو رہا ہوں۔ ڈاکٹر سے کہہ دو.....!“

”دیکھئے تو..... ڈاکٹر صاحب کھڑے ہیں...!“ وہ قدرے غصہ سے کہہ جاتی ہیں۔ لیکن راجہ صاحب جواب نہیں دیتے۔ آنکھیں نہیں کھولتے۔ زور زور سے خراٹے لینے لگتے ہیں۔ میں دھیرے سے معذرت خواہ لہجے میں ان کی بیگم کو بتاتا ہوں۔ میں ڈاکٹر نہیں ہوں۔ آپ کو غلط فہمی ہوئی۔ میں لکھنؤ سے آیا ہوں۔ میرا نام ”اوہ... اوہ... اوہ!“ اب سب خواتین مجسم تاسف بن رہی ہیں۔ اور راجہ صاحب آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے ہوئے دونوں بازو پھیلا کر ایک عجیب سے ڈھنگ سے روتے ہوئے (جو اس وقت مجھے بڑا مصنوعی لگا تھا) کہہ رہے ہیں ”میرا

دوست آیا ہے لکھنؤ سے مجھ سے ملنے..... مجھے اٹھاؤ..... ارے کم بختو! مجھے اٹھا کر بٹھا دو کہ اپنے دوست سے گلے مل سکوں۔“

اس اقتباس سے واضح ہے کہ راجہ صاحب بستر مرگ پر بھی اپنی زندہ دلی اور شگفتہ مزاجی سے افسردہ ماحول کو بھی خوشگوار ماحول بنا دیا کرتے تھے۔ سیدنا نظر حسین عزیز نے بھی ایک واقعہ نقل کیا ہے لکھتے ہیں۔

”راجہ مہدی علی خاں ماہم ہسپتال بمبئی میں زیر علاج تھے۔ ان دنوں کنہیا لال کپور ان کی مزاج پر سی کو وہاں پہنچے۔ راجہ مہدی علی خاں جو اپنی شگفتہ مزاجی اور خوش طبعی کے لئے مشہور تھے انہیں دیکھتے ہی اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر پڑھا۔

دو گھڑی آ کے ذرا بیٹھئے بیمار کے پاس
کیوں کبھی آتے نہیں عاشق مکار کے پاس
یہ سنتے ہی کنہیا لال کپور جو کھڑے ہوئے تھے ہنستے ہوئے بیٹھ گئے۔“

راجہ مہدی علی خاں جب کوئی عیادت کے لئے افسردہ چہرہ لے کر آتا اسے مسکرانے پر مجبور کر دیتے اور وہ مسکراتا۔ راجہ صاحب کو غمزدہ چہرے پسند نہ تھے۔ وہ ہر ایک چہرے سے



راجا مہدی علی خاں



غم کی پرچھائیاں تک نوج ڈالنا چاہتے تھے۔ وہ ایک ایسے عظیم کام کیلئے پیدا کئے گئے تھے جو دوسروں کو ہنسانا تھا اور وہ مرتے دم تک اپنا یہ مشن جاری رکھے ہوئے تھے۔

راجا مہدی علی خاں نے اپنی زندگی میں کسی بھی تحریک سے خود کو وابستہ نہ رکھا خواہ وہ سیاسی ہو یا ادبی جبکہ ان کے ہم عصر شعر اسیاسی اور ادبی تحریکوں سے وابستہ تھے۔ خواجہ احمد عباس، سجاد ظہیر، مخدوم محی الدین، علی سردار جعفری، کیفی اعظمی، جاٹا رانتر وغیرہ کمیونزم کے قائل تھے۔ ادبی تحریکوں میں دو بڑی تحریکیں زور و شور سے چل رہی تھیں۔ اور ان تحریکوں کے کسی بھی گروہ سے وابستگی شہرت کی ضمانت سمجھی جاتی تھی۔ یعنی ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق راجہ صاحب کا ان دونوں تحریکوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ ان کی اپنی الگ دنیا تھی اور اسی دنیا کے خود راجہ تھے۔ جس میں قہقہوں کے شگوفے ہمیشہ کھلتے رہتے تھے۔ جہاں چاند ہر وقت مسکراتا تھا اور ستارے ان کی کھلنڈ رانہ حرکتوں سے لطف اندوز ہوا کرتے تھے۔



راجہ مہدی علی خان

دوسری عالمی جنگ شروع ہو چکی تھی۔ بھائی جان ممتاز ملک کو بھی مولانا چراغ حسن حسرت اور فیض احمد فیض کے ساتھ فوج کے محکمہ انفارمیشن میں اعزازی کمیشن مل چکا تھا۔ اولڈ سیکرٹریٹ سے ایک ”فوجی اخبار“ نکلتا تھا۔ حسرت صاحب اور کمپین ملک اسی اخبار میں کام کرتے تھے۔

میں تانگے سے اتر کر تیس ہزاری والے اپنے کوارٹر میں پہنچا تو بڑی بہن سمجھ گئی کہ میں ایک بار پھر گھر سے فرار ہو کر نکلا ہوں۔ اس نے تھوڑی بہت ناراضگی کا اظہار کیا۔ زیادہ ڈانٹ ڈپٹ نہ کی۔ کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے سے میں وہاں سے بھی بھاگ جاؤں گا۔ تیس ہزاری کے یہ کوارٹر این ٹائپ تھے اور ایک قطار کی شکل میں چلے گئے تھے۔ ہر کوارٹر کے آگے چھوٹا سا برآمدہ اور پیچھے ایک صحن تھا۔ ان کوارٹروں کی حیثیت ادبی اعتبار سے بڑی تاریخی بن گئی تھی۔ کیونکہ اس زمانے میں ان کوارٹروں میں برصغیر کے چوٹی کے ادیب اور شاعر رہے تھے۔ ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں اردو کے نامور افسانہ نگار کرشن چندر رہتے تھے۔ اس سے آگے افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک کا کوارٹر تھا۔ اگلے کوارٹر میں عظیم افسانہ نگار سعادت حسن منٹو رہائش پذیر تھے۔ اس سے آگے منفرد شاعر ن۔ م۔ راشد کا کوارٹر تھا۔ اس زمانے میں یہ سب لوگ آل انڈیا ریڈیو سے وابستہ تھے۔

جب میں وہاں پہنچا تو یہ خبر گرم تھی کہ مشہور طنز نگار شاعر راجہ مہدی علی خان

بھی آرہے ہیں اور وہ ہمارے کوارٹر کے ایک کمرے میں سکونت اختیار کریں گے۔ ان سب ادیب شاعروں کی شکلوں سے میں واقف تھا۔ امرتسر کی میونسپل لائبریری میں بیٹھ کر ادب لطیف اور جہازی سائز کے رسالے ادبی دنیا میں ان کی تخلیقات کا باقاعدہ مطالعہ کیا کرتا تھا۔ مجھے بڑی خوشی ہوئی کہ ان سب شاعر ادیبوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع مل گیا۔ یہ ایک بڑا بے مثل حسن اتفاق تھا کہ اردو کے اتنے بڑے بڑے ادیب ایک جگہ اکٹھے رہ رہے تھے۔ یہ ایک تاریخی بات تھی۔ اوپندر ناتھ اشک جس کوارٹر میں رہتا تھا وہ ہمارے کوارٹر سے آگے تیسرا کوارٹر تھا۔ شام کو اس کے بلند قہقہوں کی آواز اکثر سنائی دیتی۔ اس نے دلی میں آکر کوشیلا نامی لڑکی سے دوسری شادی کر لی تھی۔ یہ چھوٹے قد کی بڑی گھریلو خاتون تھی۔ کوشیلا کسی دفتر میں ملازمت کرتی تھی اور اوپندر اشک اسے روزانہ صبح سائیکل پر چھوڑنے جاتا تھا۔ کوشیلا سے اشک کی شادی کی داستان کو افسانے کی شکل میں اشک نے اپنے افسانے ”کوارٹر نمبر سات“ میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے۔

ہمارے کوارٹر کے سامنے بھیروں جی کا ایک چھوٹا سا پرانا مندر تھا۔ یہاں صبح شام ہندو عورتیں آرتی پوجا کو آتیں اور گھنٹیوں کی آواز میں سنائی دیا کرتی تھیں۔ ان کوارٹروں کے بارے میں کرشن چندر نے بھی ایک افسانہ لکھا تھا جس کا نام ”بھیروں جی کا مندر“ ہے۔ اس افسانے میں کرشن چندر نے اتنے سارے ادیبوں کے ایک جگہ اکٹھے مل بیٹھنے کی روئیداد لکھی ہے۔ یہ بھی ایک عجیب اتفاق ہے کہ کرشن چندر ہمارے ساتھ والے کوارٹر میں رہتا تھا مگر میں اسے وہاں ایک مرتبہ بھی نہیں دیکھ سکا۔ صرف ایک بار آل انڈیا ریڈیو میں ن م راشد صاحب کے کمرے میں اسے دیکھا۔

اوپندر ناتھ اشک بڑا کنجوس تھا۔ اس کی کنجوسی کے اس کے دوستوں میں بڑے چرچے ہوتے۔ منٹو اور راجہ مہدی علی خان اسے آڑے ہاتھوں لیتے تھے۔ مجھے خواب کی طرح یہ منظر یاد ہے۔ اوپندر ناتھ اشک نے اپنے کوارٹر میں چائے پر سب ادیبوں کو بلایا تھا۔ میں بھی بھائی جان کے ساتھ وہاں موجود تھا۔ راشد صاحب، منٹو، راجہ مہدی

علی خان اور کرشن چندر اور ایک دوسرے صاحب ہوا کرتے تھے وہ بھی وہاں موجود تھے۔ کمرے کی دیوار پر زنانہ ریشمی سوٹ لٹکے ہوئے تھے۔ منٹو نے ان کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

”اشک بڑا کمینہ ہے۔ یہ ریشمی سوٹ یہاں اس لئے لٹکا رکھے ہیں اس نے کہ ہم پر رعب پڑے کہ اس کی بیوی کے پاس اعلیٰ قیمتی سوٹ ہیں۔“

راجہ مہدی علی خان نے اس محفل میں اشک کی کنجوسی کا ایک فرضی واقعہ گھڑ کر سنایا تھا۔ اس کے سوا مجھے اس یادگار محفل کی اور کوئی بات یاد نہیں رہی۔

جس روز راجہ مہدی علی خان ہمارے کوارٹر میں رہنے کے لئے آئے میں گھر پر نہیں تھا۔ دلی شہر کی آوارہ گردی کو نکلا ہوا تھا۔ شام کو واپس آیا تو بھائی جان کے پاس برآمدے میں ایک گول مٹول موٹی گردن والا آدمی بیٹھا تھا۔ پہلی نظر میں وہ مجھے کوئی پہلوان لگا۔ بھائی جان نے میرا تعارف کروایا اور معلوم ہوا کہ یہ راجہ مہدی علی خان ہے۔ راجہ صاحب آل انڈیا ریڈیو دلی میں ملازم ہو کر آئے تھے۔ دلی آتے ہی انہوں نے ایک نئی سائیکل خریدی۔ یہ سائیکل ہمارے کوارٹر کے ایک کمرے میں پڑی ہوئی تھی۔ شام کو میں سائیکل نکال کر تیس ہزاری کے علاقے کی سڑکوں پر مڑ گشت کو نکل جاتا۔ راجہ مہدی علی خان میرے ساتھ بڑی شفقت کا سلوک کرتے۔ اس زمانے میں میرا جسم بھاری تھا۔ وہ بھی مجھے پہلوان کہہ کر بلایا کرتے تھے۔ ایک روز مجھے بڑی رازداری سے کہنے لگے۔

”ریڈیو سٹیشن کے پاس جو میڈن ہوٹل ہے اس کے باہر فٹ پاتھ پر ایک انگریز عورت پان بیچتی ہے۔“

میں علی پور روڈ سے کئی بار گذرا تھا مگر مجھے وہاں کبھی کوئی ایسی عورت نظر نہیں آئی تھی۔ میں نے تعجب کا اظہار کیا تو راجہ مہدی علی خان نے فوراً کہا۔

سائیکل پر بیٹھو۔ میں ابھی چل کر تمہیں دکھاتا ہوں۔ میں تو روز اس سے پان خریدتا ہوں“ انہوں نے مجھے سائیکل پر بٹھایا اور علی پور روڈ کی طرف چل پڑے۔

میڈن ہوٹل کے باہر سائیکل روکی اور ایک طرف اشارہ کر کے کہا۔

”وہ دیکھو انگریز عورت جو پان بیچتی ہے۔“

میں نے دیکھا کہ فٹ پاتھ پر دیوار کے ساتھ ایک انتہائی کالی کلوٹی مدراسی عورت پان سگریٹ کی چھابڑی سامنے رکھے بیٹھی تھی۔ راجہ صاحب نے ققمہ لگا کر کہا۔

”کیوں؟ ہے نہ پوری انگریز عورت!“

راجہ مہدی علی خان افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک کو بہت تنگ کیا کرتے تھے۔ ہمیشہ اس کی کنجوسی کو نشانہ بنا کر اسے چھیڑتے۔ اوپندر ناتھ اشک خالص ہوشیار پوری لہجے میں صرف یہی کہتا۔

”تیس باز نہیں آئے گا راجیا؟“

مجھے معلوم نہیں کہ یہ لہجہ ہوشیار پوری تھا یا جالندھری۔ مگر اشک پنجابی اسی لہجے میں بولتا تھا۔

ایک خوشگوار شام کا ذکر ہے اور یہ شام میری یادوں کے جھروکوں میں اسی طرح روشن ہے۔ میری بہن اور کوشیلا سیر کرنے کو ارٹوں سے نکلیں۔ میں بھی راجہ کی سائیکل پر بیٹھا ان کے ساتھ تھا۔ کبھی سائیکل زور سے چلاتا ان سے آگے نکل جاتا اور کبھی ان کے ساتھ ساتھ سلو موشن میں سائیکل چلاتا چلا جاتا۔ ہم بڑی سڑک پر آئے جس کا نام مجھے یاد نہیں رہا تو اوپندر ناتھ اشک کی بیگم کوشیلا نے رک کر آپا سے کہا۔

”پان تم ہم گھر پر ہی بھول آئے“

آپا کے پاس بڑا خوبصورت ایک پاندان ہوا کرتا تھا۔ وہ پان کھانے کی عادی تھیں۔ بات یہ ہوئی کہ آپا نے پان لگا کر نعمت خانے پر رکھے اور ساتھ لے جاتے وقت بھول گئیں۔

آپا نے مجھے گھر جا کر پان لانے کا آرڈر دیا۔ میں نے پیڈل پر ایک پاؤں کا سارا بوجھ ڈالا اور لہراتا ہوا سائیکل چلاتا ہوا سے باتیں کرتا کوارٹر پہنچ گیا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ راجہ مہدی علی خان برآمدے میں آرام کرسی پر بیٹھے ہیں۔ مجھے دیکھتے ہی بولے۔

”اچھا تو پہلوان تم لے جاتے ہو شام کو میری سائیکل۔ اب میں تم سے اس کا کرایہ وصول کروں گا“

جب میں نے انہیں بتایا کہ میں پان لینے آیا ہوں تو وہ ہنس کر کہنے لگے۔
 ”ارے پہلوان! وہ پان تو میں کھا گیا ہوں چلو کوئی بات نہیں۔ میں خود پان لگا کر دیتا ہوں“

راجہ صاحب کچن میں گئے۔ اپنی پھولی ہوئی ہتھیلی پر باری باری پان رکھ کر کتھا چونا لگایا اور دونوں پان کانڈ میں لپیٹ کر مجھے دیئے اور کہا۔
 ”یہ لو پہلوان! مگر سائیکل آرام سے چلاتا“

میں پان لے کر چل پڑا۔ جب تک راجہ صاحب کی نظروں میں رہا سائیکل بڑے آرام سے چلاتا رہا۔ جو نہی وہ نظروں سے اوجھل ہوئے میں نے سپیڈ پکڑ لی اور ہوا سے باتیں کرتا بیگم اشک کے پاس پہنچ گیا۔

دلی میں میرا کام شہر کی آوارہ گردی کرنا اور فلمیں دیکھنا تھا۔ شیشن کے ایک قریبی سینما گھر میں کاردار کی ایک قلم لگی جس کا نام میں بھول گیا ہوں۔ اس میں نرملا اور ارون نے کام کیا تھا ارون کو قلم میں کام کرتے دیکھ کر میرے دل میں ایکٹرن بننے کی جو چھپی ہوئی خواہش تھی وہ ایک بار پھر بیدار ہو گئی۔ ویسے بھی دلی کی آوارہ گردی سے میرا دل بھر گیا تھا۔ میں نے بڑی بہن سے کچھ پیسے لئے اور ایک روز فرنٹینر میل میں سوار ہو کر بمبئی روانہ ہو گیا۔ ریل گاڑیوں میں زیادہ رش نہیں ہوا کرتا تھا۔ فرنٹینر میل کے ڈبے سبز رنگ کے ہوتے تھے جو مجھے بہت پسند تھے۔ بارش میں یہ ریل گاڑی ہرے بھرے کھیتوں اور جنگلوں سے گذرتی تو مجھ پر وارفتگی سی طاری ہو جاتی۔ گاڑی دلی سے چلی تو نئی دلی کے شیشن پر تھوڑی دیر کو رکی۔ پھر نفاذ الدین پر رکنے کے بعد جو چلی تو طوفان میل کی رفتار سے چلتی مترا پہنچ گئی۔ پھر آگرہ کینٹ۔ پھر گوالیار۔ اس کے بعد جھانسی..... بھوپال کا شیشن کہیں رات کو آیا۔ رات بھر ٹرین جنگلوں، کھیتوں، درباروں پہاڑی علاقوں اور بستیوں کو پیچھے چھوڑتی آگے بڑھتی چلی

گئی۔ پو پھٹ رہی تھی کہ کھنڈو کا سٹیشن آگیا۔ کھنڈو اسٹیشن پر میں نے پلیٹ فارم پر کھڑے کھڑے دوپہر کا کھانا کھایا۔ پھر بھوسا ل ٹاسک اور دیوالی سے نکلتی ہوئی فرنیچر میل اگت پوری جا کر رک گئی۔

آگے کچھ چڑھائی تھی۔ ٹرین کے پیچھے بھی ایک بجلی کا انجن لگا دیا گیا۔ کافی دیر بعد ٹرین بمبئی کے مضافات میں داخل ہو گئی۔ کلیان، داور اور پھر ممبئی سنٹرل کا سٹیشن آ گیا۔ بمبئی میں میرا کوئی جاننے والا نہیں تھا لیکن اس بات کی میں نے کبھی پرواہ نہیں کی تھی۔ میں فلتے بھی کر سکتا تھا اور فٹ پاتھ اور ریلوے پلیٹ فارموں پر بھی سوتا رہا تھا۔ مقصد صرف ایڈو پنجر اور نئے نئے شہر نئے نئے لوگ دیکھنے سے تھا۔ اس بار تو میں ایکٹر بننے کا پکا ارادہ کر کے دلی سے چلا تھا۔ آدمی سفر پر نکل پڑے تو کوئی نہ کوئی سبب بن ہی جاتا ہے۔ چنانچہ اس دفعہ بھی ایک لڑکے سے ملاقات ہو گئی جو اندھیری میں واقع پرکاش سٹوڈیوز میں کام کرتا تھا۔ چھ سات روز پرکاش سٹوڈیوز کے چکر لگاتا رہا۔ چھوٹی عمر تھی، بھلا میں کیسے ایکٹر بن سکتا تھا۔ اس سٹوڈیو میں مس پر میلا، کامیڈن آغا، گلاب اور دوسرے کئی فلمی اداکاروں کو دیکھا۔ شوٹنگ کا تھا کا دینے والا عمل دیکھ کر دل سے ایکٹر بننے کا خیال غائب ہو گیا۔ اب شہر کی آوارہ گردی کو نکل کھڑا ہوا۔ دن بھر شہر کی لمبی لمبی سیریں کیں، رات کو اپنے مسلمان دوست کی کھولی کو خیر باد کہا اور ممبئی ایکسپریس میں سوار ہو کر واپس دلی روانہ ہو گیا۔

نئی دلی کے سٹیشن پر اتر کر پیدل ہی میدان اور کچے ٹیلوں میں سے ہوتا ہوا تیس ہزاری کے کوارٹروں میں نکل آیا۔ میں چھوٹے سے ٹیلے سے اتر کر اپنے کوارٹر کی طرف آ رہا تھا کہ راجہ مہدی علی خان پر نظر پڑی۔ وہ سائیکل کوارٹر سے نکل کر دفتر جا رہے تھے۔ مجھے دیکھا تو رک گئے۔ انہیں پتہ چل گیا تھا کہ بمبئی ایکٹر بننے گیا ہوا ہوں۔ اس زمانے میں پنجاب سے جو بھی خوش شکل لڑکا گھر سے بھاگ کر بمبئی جاتا لوگ یہی سمجھتے کہ وہ فلمی اداکار بننے گیا ہے۔ راجہ مہدی علی نے مجھے دیکھتے ہی طنزیہ انداز میں کہا۔

”آگے ہو پہلوان ایکسٹرن کے؟“

مجھے ان کی یہ بات بڑی بری لگی۔ غصے سے منہ پھلائے میں اپنے کوارٹر میں گھس

گیا۔

ان ہی دنوں راجہ مہدی علی خان کی شادی کی بات شروع ہوئی۔ راجہ صاحب کی شادی لکھنؤ میں طے پائی تھی۔ یہ شادی میرے سامنے نہیں ہوئی۔ بارات تیس ہزاری والے کوارٹروں ہی سے گئی تھی اور بڑی بہن اور بھائی جان ایک طرح سے بارات لے کر لکھنؤ گئے تھے۔ مگر یہ سب کچھ میرے بعد ہوا۔ میں دلی سے کلکتے کی طرف نکل چکا تھا۔ لیکن جب شادی کی بات چل رہی تھی تو میں وہیں تھا۔ راجہ صاحب کو میری بڑی بہن پر اعتماد تھا۔ ایک روز میرے سامنے انہوں نے بڑی بہن سے کہا۔

”آپ! آپ لوگوں نے میری شادی کی بات تو شروع کر دی ہے مگر ذرا غور کرو

میری اس سور ایسی موٹی گردن کے ہوتے ہوئے مجھ سے کون لڑکی شادی کرے گی“

میں کسی مبالغے سے کام نہیں لے رہا۔ یہ باتیں میرے سامنے ہوئی تھیں جو

باتیں جو منظر مجھے یاد ہوتے ہیں وہ اپنی پوری تفصیل کے ساتھ مجھے یاد رہتے ہیں۔ اس

وقت بھائی جان یعنی کیپٹن ملک بھی وہاں موجود تھے جن کی راجہ سے بڑی بے تکلفی

تھی۔ بھائی جان نے کہا۔

”تو اس سور کی گردن کو کچھ گھٹاؤ“

دوسرے دن سے راجہ مہدی علی خان نے روزانہ صبح کی سیر اور ورزش شروع کر

دی۔ تیس ہزاری میں ہی ایک آموں کا باغ تھا۔ راجہ مہدی علی خان صبح سائیکل

پر وہاں سیر کرنے جاتے، سائیکل ایک طرف رکھ کر گردن کو دائیں بائیں ہلا کر ورزش

کرنی شروع کر دیتے۔ ڈنڈ بیٹھکیں بھی نکالتے۔ میں ان کے ساتھ ہوتا کیونکہ صبح کی سیر

کا میں بچپن ہی سے عادی تھا۔ راجہ کا سانس بہت جلد پھول جاتا کیونکہ وہ بھاری بدن

کے تھے، پھولے ہوئے سانس کے ساتھ کہتے۔

”پہلوان! یہ ورزش تو بڑی مہنگی پڑے گی، گردن پتلی ہونے کی بجائے کہیں اور

زیادہ موٹی نہ ہو جائے“

چھ سات دن ورزش کرنے کے بعد راجہ صاحب نے بھائی جان سے صاف صاف کہہ دیا۔

”ملک یار یہ کام مجھ سے نہیں ہوتا“ میں اپنی گردن کا منکا نہیں تڑوانا چاہتا۔ لڑکی والوں سے کہہ دو کہ اگر سو کی گردن قبول ہے تو ہم بارات لے کر آجائیں گے“

بھائی جان نے یہ بات نہ م راشد کو بتا دی اور کہا کہ راجہ کی گردن نے پتلی ہونے سے انکار کر دیا ہے۔ یہ بات منٹو، اشک اور کرشن چندر کو بھی معلوم ہو گئی۔ انہوں نے مل جل کر راجہ کی گردن کی شان میں دو تین شعر گھر ڈالے جو مجھے آج بھی یاد ہیں۔

راجہ کی گردن بھینے کی گردن
 بھینے کی گردن راجہ کی گردن
 گینڈے کی گردن راجہ کی گردن
 گردن کی گردن راجہ کی گردن

لیکن اسی گردن کے باوجود راجہ کی شادی ہو گئی اور سنا ہے بڑی دھوم دھام سے شادی ہوئی۔

دوسری بار دلی آیا تو راجہ مہدی علی خان شادی شدہ تھے اور ابھی تک دلی ریڈیو پر ہی ملازمت کرتے تھے۔ یہ دوسری جنگ عظیم کا آخری روز تھا۔ راجہ صاحب پہلے سے زیادہ موٹے ہو گئے تھے اور گردن بھی کافی موٹی ہو چکی تھی۔ میں ریڈیو سٹیشن راشد صاحب کے کمرے میں بیٹھا ہوا تھا کہ راجہ صاحب نمودار ہوئے۔ مجھے دیکھ کر بڑے خوش ہوئے۔

”پہلو ان! تم تو بڑے ہو گئے ہو“

پھر مجھے ساتھ لے کر ریڈیو سٹیشن کی کینٹین پر آ گئے۔ چائے پلائی اور کچھ شاف

رہنمائیوں سے بھی ملوایا جن میں سے مجھے ایک ہری چند چٹہ اور ایس ایس ایس اے ٹھاکر
 نا دھندلی سی شکلیں یاد رہ گئی ہیں۔ ٹھاکر کو وہاں تھری ایس ٹھاکر کے نام سے پکارا جاتا
 تھا۔ یہ بڑے کمال کے رامہ آرٹس تھے۔ بعد میں اخلاق احمد دہلوی سے ان لوگوں کے
 بارے میں بے حد دلچسپ باتیں سنیں۔ ان دنوں ریڈیو سٹیشن پر زیب نام کی ایک
 رامہ آرٹس خاتون تھیں۔ بعد میں انہوں نے فلم ایکٹر شیم سے شادی کر لی تھی۔
 مجھے یاد ہے زیب صاحبہ نے چوخانوں والا لمبا کوٹ پہن رکھا تھا۔ راجہ مہدی علی نے
 کہا۔

”یہ ملتان کی کھیس کا کون ہے“

میں کچھ روز دلی میں رہا پھر برما کی طرف چل دیا۔

اس کے بعد راجہ مہدی علی خان سے پھر ملاقات نہ ہوئی۔ راجہ صاحب وہاں سے
 بمبئی چلے گئے اور فلمی دنیا میں شاعری شروع کر دی اور دیکھتے ہی دیکھتے ان کے فلمی
 گیت برصغیر میں گونجنے لگے۔ وہ بڑے خوبصورت ادبی گیت اور غزلیں فلموں کے لئے
 لکھ رہے تھے۔ انہوں نے گاڑی بھی لے لی تھی۔ فلمی دنیا کا مشہور کامیڈین محمود ان کا
 ڈرائیور تھا۔ ایک بار اپنے انٹرویو میں کامیڈین محمود نے کہا تھا کہ میں نے اپنی فلمی
 زندگی کا آغاز راجہ مہدی علی خان صاحب کی ڈرائیوری سے شروع کیا اور وہی مجھے
 ہی دنیا میں لائے تھے۔ حالانکہ محمود کے والد خود فلمی دنیا کے بہت بڑے رقص
 ٹامبیڈین رہ چکے تھے۔ مگر محمود نے اعتراف کیا کہ میں راجہ صاحب کے پاس بطور شو فر
 ملازم تھا اور ان ہی کی وساطت سے مجھے ایک فلم میں چھوٹا سا رول ملا تھا۔ اس کے بعد
 محمود نے اپنی خداداد قابلیت کے باعث بہت ترقی کی اور بہت شہرت کمائی۔

راجہ مہدی علی خان کو قیام پاکستان کے بعد صرف ایک بار پردہ سیمیں پر دیکھا۔
 سعادت حسن منٹو ان دنوں بچے ٹائیکز سے وابستہ تھے جس کا نام فلمستان ہو گیا تھا۔ منٹو
 نے ”آٹھ دن“ نام کی ایک فلم لکھی جس میں کچھ شاعروں ادیبوں نے بھی تھوڑا تھوڑا
 کام کیا تھا۔ افسانہ نگار اوپندر ناتھ اشک نے ایک پردہت کا رول ادا کیا۔ خود سعادت

حسن منٹو نے بھی ”آٹھ دن“ میں ایک نیم جھپٹی آدمی کا بڑا اہم کردار ادا کیا اور حیرانی کی بات ہے کہ بے حد کامیاب رہے۔ اسی قلم میں ایک بار شاعر میراجی بھی تھوڑی دیر کے لئے پردہ سیمیں پر نمودار ہوئے۔ شاید انہیں لیٹر باکس میں خط ڈالتے دکھایا گیا تھا۔ اس قلم میں راجہ مہدی علی نے باقاعدہ ایک کردار ادا کیا تھا۔ ان کا ایک سین مجھے آج بھی یاد ہے۔ راجہ صاحب عدالت میں پیش ہوتے ہیں۔ وہ گواہوں کے کھڑے میں کھڑے ہیں۔ جج صاحب پوچھتے ہیں۔

”کیا تمہارے پاس بندوق تھی؟“

راجہ صاحب جواب دیتے ہیں۔

”جناب! تھی بھی اور نہیں بھی تھی“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“ جج صاحب تعجب سے پوچھتے ہیں، راجہ مہدی علی خان کہتے ہیں۔

”جناب! بندوق تھی اس لئے کہ تھی اور نہیں تھی اس لئے کہ خالی تھی“

سعادت حسن منٹو نے اس میں بڑے کمال کے مکالمے لکھے تھے۔ راجہ مہدی علی خان اپنی شہرت کے عروج پر تھے کہ ایک روز اخبار میں خبر چھپی کی راجہ صاحب کا انتقال ہو گیا۔ ان کا چہرہ ان کا مسکراتا، صبح کی ورزش اور سائیکل چلانا، سب کچھ یاد آ گیا۔ مگر صرف یاد کر لینے سے کون واپس آتا ہے!





۱۹۹۷ء فلمرز انٹرنیشنل سوسائٹیشن سمیٹی کی جانب سے از مرگ فلمی نوبل انعام برائے مہدی علی خان کو اعزاز دیا گیا۔ محترمہ طاہرا سلطانہ نے

نوبل انعام مہدی علی خان کو پیش کیا۔ نوبل انعام کے فاتحین کو اعزاز حاصل کرتے ہوئے





راجہ مہدی علی خاں ان کی اہلیہ طاہرہ سلطانہ مخفی اور بھانجے خالد صدیقی